بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کیریکٹر کیسے پیدا ہوتا ہے

ہمارے ہاں ایک عام کہاوت ہے کہ ”مال صدقۂ جان۔ جان صدقۂ آبرو“ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو مال‘ جان‘ آبرو‘ میں سے ہر شے اپنی اپنی جگہ قابل قدر اور مستحقِ حفاظت ہے لیکن اگر کبھی ایسا واقعہ پیش آجائے کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز بچائی جا سکے تو جان کی حفاظت کے لئے مال قربان کر دینا چاہئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جان کی قدر و قیمت مال سے زیادہ ہے۔ لیکن اگر کسی وقت جان اور آبرو میں تصادم (Clash) ہو جائے یعنی ان میں سے ایک ہی چیز بچائی جا سکے تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان کو قربان کر دینا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آبرو کی قیمت جان سے بھی زیادہ ہے۔ اور آبرو سے بڑھ کر کسی چیز کی قیمت نہیں۔ یعنی کوئی شے ایسی نہیں جس کے حصول یا حفاظت کے لئے آبرو کو قربان کر دینا جائز قرار پا سکے۔ اس حقیقت کو بالفاظ دیگر یوں بیان کریں گے کہ مال اور جان کی قیمت اضافی (Relative) ہے لیکن آبرو کی قیمت مطلق (Absolute) یا ذاتی (Intrinsic) ہے۔ اخلاقیات کی دنیا میں اس قسم کی چیزوں کو مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اقدار جن کے تحفظ کے لئے ان سے کم قیمت کے اقدار کو قربان کر دینا چاہئے لیکن انہیں کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

لیکن جہاں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو آبرو کے تحفظ کے لئے جان کو بلا تامل سپرد اجل کر دیں گے وہاں آپ ایسے لوگ بھی دیکھیں گے جو آبرو کے لئے جان دینا تو ایک طرف‘ اسے دو ٹکوں کے عوض بیچ ڈالیں گے۔ یعنی ان کے نزدیک مال کی قدر‘ آبرو سے کہیں زیادہ ہوگی۔ آپ ان لوگوں کو نہایت ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے لیکن انہیں اس کا احساس تک بھی نہیں ہوگا کہ ان سے کوئی معیوب حرکت سرزد ہو رہی ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپ کی نگاہوں میں آبرو کی قیمت مال سے زیادہ ہے اور ان کے نزدیک مال کی قیمت آبرو سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں کے متعلق آپ کہیں گے کہ ان کا کوئی کیریکٹر نہیں۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر‘ کیریکٹر کے معنی یہ ہیں کہ بلند قدر کی خاطر کمتر قدر کو قربان کر دیا جائے۔ جن قوموں کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ ان کے افراد کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس قوم کے افراد **ذاتی مفاد پر قومی مفاد** کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ذاتی مفاد کے مقابلہ میں قومی مفاد کو زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور اس کے تحفظ کے لئے ذاتی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں جو کچھ گذشتہ سال ہا سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی لوگ اپنے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی کا نام کیریکٹر کا فقدان

ہے۔سوال یہ ہے کہ جن قوموں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ان کے افراد میں اس قسم کا کیریکٹر کیسے پیدا ہو گیا؟ آپ ان کی تاریخ پر غور کیجئے۔اس سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے صدیوں سے اپنے بچوں کو اس بات کی تعلیم دینی شروع کر رکھی ہے کہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا شرف وعزت کا باعث ہے۔ان کے بچوں کو یہ تعلیم صرف مدرسوں اور کالجوں کی چار دیواری میں ہی نہیں دی جاتی۔ وہ جدھر سے گزرتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں' ہر طرف سے یہی آواز ان کے کان میں پڑتی ہے۔ یہی وہ فضا ہے جس میں وہ زندگی کے اولیں سانس سے نشو ونما پاتے ہیں۔ کتابوں میں' اخباروں میں' تقریروں میں' چرچ میں' ٹی۔وی پر' گھر میں' کھیل کے میدان میں' بزم میں' رزم میں' ہر جگہ اور ہر مقام پر یہی نقشہ ان کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔علم النفس کا اصول یہ ہے کہ اگر آپ دو تین نسلوں تک بچوں کو ایک خاص نہج کی تعلیم وتربیت دیں تو اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اسی قسم کے خیالات دل میں لے کر ابھریں گی۔ جس طبقہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے (کہ ان کے نزدیک مال کے مقابلہ میں آبرو کی قیمت کچھ نہیں) آپ ان کے بچوں کو ابتدا ہی سے ان کے ماحول سے نکال کر' ایسے ماحول کی طرف منتقل کر دیں' جہاں ان کے کان میں' مسلسل اور پیہم یہ آواز پڑتی رہے کہ آبرو کی قیمت مال سے کہیں زیادہ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے ہو کر ان کے زاویۂ نگاہ میں کس قدر تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں ہمارے ساتھ ہوا یہ کہ مختلف اقدار کی تعلیم تو ایک طرف' ان کا تصور تک بھی کسی کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔کسی کو یہ بتایا ہی نہ گیا کہ زندگی کی کچھ اقدار بھی ہوتی ہیں اور یہ اقدار ہی ہیں جن سے انسان حیوانی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

قرآن کریم زندگی کی اقدار کا تعین کرتا ہے۔ وہ مستقل اقدار بھی دیتا ہے اور اضافی بھی۔ نیز وہ اپنی حکمتِ بالغہ سے ایسے مواقع کی تصریح بھی کرتا ہے جن میں ایک کمتر درجہ کی قدر کو بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا ضروری ہوتا ہے۔قرآن کی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ان اقدار کو واضح طور پر سامنے لایا جائے اور مسلسل اور پیہم تکرار واصرار سے انہیں دل کی گہرائیوں میں جاگزیں کر دیا جائے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ ان اقدار کے تحفظ سے نتائج کیا مرتب ہوتے ہیں اور اس کا ثبوت تاریخی دلائل وشواہد سے بہم پہنچایا جائے۔اس طریق تعلیم سے ان اقدار کی صداقت کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت یقین پیدا ہو جائے گا (اسی کو ایمان کہتے ہیں) اور اس سے قلب ونگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی جس سے ہر شے کا صحیح صحیح مقام متعین ہو سکے گا۔ جب یہ سلسلۂ تعلیم وآگہی دو چار نسلوں تک مسلسل جاری رہے گا تو معاشرہ میں اکثریت ان لوگوں کی ہو جائے گی جن کے ذہنوں میں ان اقدار کی گونج اور جن کی زبانوں پر ان کا چرچا ہوگا۔اس سے وہ فضا پیدا ہو جائے گی جس میں سانس لینے والے بچے غیر شعوری طور پر ان اقدار کا احساس لئے ہوئے پروان چڑھیں گے۔ چونکہ عمل کی بنیاد انسان کے نظریات وتصورات پر ہوتی ہے اس لئے خیالات کی اس تبدیلی سے عمل میں خود بخود تبدیلی آ جائے گی۔اسی کا نام کیریکٹر ہے۔ چونکہ ہم کبھی اس طریق پر عمل پیرا نہیں ہوئے اس لئے ہمیں یہ بات کچھ یونہی قیاسی اور ذہنی سی دکھائی دیتی ہے (کہ اقدار کا صحیح تصور دل میں جاگزیں ہو جانے سے کیریکٹر میں تبدیلی آ جاتی ہے) لیکن قرآن کے بیانات۔اقوام عالم کے احوال وکوائف اور خود ہمارے قرنِ اول کی صحیح تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوم میں کیریکٹر پیدا کرنے کا اس کے سوا کوئی اور طریق نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

تبدیلی کی ابتدا

تبدیلی کبھی بھی طاقت سے نہیں آتی۔ مراد یہ کہ خارجی دباؤ سے فرد کے اندر کوئی تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔ ہاں مفاہمت ہوسکتی ہے‘ جس کا نسبتاً کھردرا نام منافقت ہے۔ اگر کوئی صورتحال کو دل سے بدلنے کا متمنی ہے تو پھر اسے نہایت مضبوط اعصاب کا مالک ہونا چاہئے۔ ایک ایک فرد سے رابطہ ضروری ہے۔ اس کے ذہنی معیار کے مطابق گفتگو ناگزیر ہے۔ فوری متوقع ریسپانس نہ ملنے کی صورت میں دل برداشتہ نہیں ہونا بلکہ پوری استقامت کے ساتھ پیغامِ حق‘ اپنی خالص شکل میں باطل کی معمولی سی ملونی کے بغیر مخاطب تک متواتر پہنچاتے رہنا ہے۔ سب سے بڑھ کر جسے آپ سچ سمجھتے ہیں‘ ہمہ وقت یہ دھیان رکھنا ہے کہ کہیں غیر شعوری طور پر بھی آپ کا عمل‘ اس سچ کی نفی نہ کردے ورنہ برسوں کی ریاضت عموماً اس ایک کمزور ساعت کی نذر ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے۔

اب تبدیلی کا خواب سب دیکھ رہے ہیں۔ ہماری بات میں تاثیر اس لئے نہیں رہی کہ ہمارے اقوال ہمارے اعمال کی تائید سے یکسر تہی ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے طریق کار میں فاش تکنیکی خامیاں ہیں۔ مثلاً ہمیں یہ تک معلوم نہیں کہ ہمارا اپنا ’’نظریہ حیات‘‘ کیا ہے؟ زبان کی حد تک سب مسلمان ہیں‘ قرآن پر ہمارا ایمان ہے‘ پاکستان ہمارا مان ہے‘ مگر سمتیں بالکل برعکس ہیں‘ مسافتیں اور منزلیں اور۔ دیکھئے بعض باتیں مشکل ہوتی ہیں‘ بعض ناممکن۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ کسی سچ کو بغیر تجربی شہادت کے تسلیم کرلیں‘ چاہے اس کی سطح کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔ اور جہاں جانے بوجھے پرکھے بنا کچھ ’’تسلیم‘‘ کرلیا جائے‘ اس کے نتائج من وعن وہی نکلتے ہیں جنہیں ہم کئی دہائیوں سے بھگت رہے ہیں۔ مثلاً ہم نے مان لیا کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ پھر ہم اللہ کی اس کتاب سے راہنمائی کیوں نہیں لیتے؟ اس لئے کہ جدید زندگی کے مسائل کا حل ’’ڈھونڈنے والوں‘‘ نے اس میں سے ڈھونڈا ہی نہیں۔ ہاں اس کے متوازی جو حل مختلف اقوام نے تلاش کئے ہیں‘ ان ریڈی میڈ ’حلات‘ پر ہی ہم بھی انحصار کررہے ہیں۔

مانا کہ یہ المیہ ہے پر ہم کریں کیا؟ ہمارے پاس کیا اس کے علاوہ Choice ہے؟ یا پھر جو حل ہمارے اکابرین نے دریافت کئے ہیں‘ ان پر Depend کریں؟ اس کا حال سن لیں‘ اس وقت دنیا کے پچاس ممالک Live دیکھتے ہیں کہ

دنیا میں ایک ''قوم'' ایسی بھی بستی ہے جو اپنی مشکلات استخاروں کی وساطت سے دور کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ اس قوم کا کوئی فرد بیمار ہو جائے تو وہ تعویذ سے درست ہو جاتا ہے۔ کوئی معاشی مسئلہ ہو عامل کسی جن کو Depute کر دیتا ہے' آناً فاناً مال کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ نجومی کی ہدایت کے مطابق لوگ باگ سفر کرتے ہیں۔ اور بامراد لوٹتے ہیں۔ جادوگر کا لونیاں تعمیر کرتے ہیں' یوں بے گھروں کو گھر مل جاتے ہیں۔ شادی تک کے معاملات یہی پروفیشنل ساحر اور ٹونے کے ماہر طے کرتے ہیں' نتیجہ معلوم ہر گھر میں ایسی خوشگوار ازدواجی زندگی رقص کناں ہے کہ عالم میں نظیر نہیں ملتی۔ عدالتیں' پولیس اور دیگر اداروں سے بے نیاز اس دھرتی میں تمام وارداتوں کی تفتیش ''بابے'' کرتے ہیں۔ بے گناہوں کو باعزت بری کر دیتے ہیں اور گناہگاروں کو عبرت کی مثال بنا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس ملک میں ٹریفک پولیس تک موجود نہیں ہے۔ رجال الغیب ہر سڑک/ چوراہے میں تعینات ہیں جو نظر تو نہیں آتے مگر پوری ٹریفک کو اس طرح کنٹرول کرتے ہیں کہ کبھی کوئی بدنظمی ہوئی ہے نہ کوئی حادثہ ہی کبھی رونما ہوا ہے......!

ہماری پستی کا کیا کوئی اندازہ کر سکتا ہے' ہم کس پاتال میں جا گرے ہیں؟ یاد رکھئے جب تک ہم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر لیتے کہ اللہ کے قوانین ناقابلِ تبدیل ہیں' کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اس کا ایک قانون ہے کہ وہ رنگ و نسل وعقیدہ وقومیت کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا۔ اب اس ضابطے کو کوئی بدل کر دکھائے۔ نہیں بدل سکتا۔ دنیا کی ساری قوتیں مل کر بھی اسے تبدیل نہیں کر سکتیں۔

اس کے ساتھ ہی اس کا ایک اور قانون بھی فعال ہے کہ سطح ارض پر مقیم جو قوم بھی جس نوعیت کی محنت کاوش کرے گی' وہ اس کے مطابق متعین نتیجے سے لازماً ہمکنار ہوگی۔ مثلاً ''بے دین'' سائنسدان لیبارٹری میں دس برس کھڑے ہو کر کسی مسئلے پر تحقیق کرتے رہیں جب وہ آخری نتیجے کو رقم کرنے لگیں تو غیب سے موکل آ کر انہیں اور ان کے سارے کام کو راکھ کی چٹکی میں بدل دیں۔ کبھی ایسا ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کے برعکس پانچ سات سو پختہ عقائد کے مالک چار چھ برس ایک وسیع وعریض حجرے میں اپنے مخصوص وظیفے چلے کرتے رہیں' آخری دن دنیا یہ دیکھے کہ زمین اپنے سارے خزانے اگل رہی ہے۔ پٹرولیم کی مصنوعات سے لے کر چاندی سونے کے زیورات سب قطار باندھے تشریف لا رہے ہیں۔

ایسے سپنے دیکھنا ''عقلمندوں'' کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ ایک پسماندہ اور ترقی یافتہ قوم کے بیچ بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قوم نے Cause کا Effect کے ساتھ رشتہ ڈھونڈ لیا ہوتا ہے جبکہ پسماندہ قوم کے افراد توہمات کے پجاری ہوتے ہیں۔ آپ غور کریں کہ بنا کوشش کئے جب ہم اوپر والے سے حسبِ ضرورت کچھ طلب کرتے ہیں اور ہماری وہ مانگ پوری نہیں ہوتی تو ہمارا وجود مایوسی کے صحرا کے ایک قدم اور قریب نہیں ہو جائے گا؟ کب تک جعلی پیر سائیں کی تاویلات آپ کو خوش گمانی کے نخلستان میں روکے رکھیں گی؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ بچہ مناسب علاج نہ ہونے کے سبب مر گیا' کوئی بات نہیں' اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی' اور حکمت یہ ہوگی کہ اس نے بڑے ہو کر کافر ہو جانا تھا۔ بھئی کافر ہو

جانا تھا تو اسے دنیا میں آنے ہی نہ دیا جاتا اور جوان گنت کافر دندنا رہے ہیں' ان کی اس ''دندناہٹ'' میں کیا حکمت کارفرما ہے؟

یارو! اب اس پھندے سے نجات پالو کہ بہت ہو چکی۔ کل کو اپنے خالق و مالک کی عدالت میں حاضر بھی ہونا ہے' کیا منہ لے کر جائیں گے؟ کیسے اس کا سامنا کریں گے؟ کیا وضاحت پیش کریں گے؟ جب اس نے کہا: بھئی یہ سب کچھ جو تم کہتے/کرتے رہے' میں نے تو تمہیں اس کا کبھی حکم نہیں دیا تھا۔ میں تو اسباب کے ذریعے تم تک پہنچا تھا اور تم نے میرے ہی خلق کئے ہوئے اسباب کی اس قدر توہین کی کہ ان پر انحصار کو کفر تک بتاتے رہے۔ اب بتاؤ تمہارا ٹھکانا کیا ہے؟

سو آخر میں ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ قرآنی طرزِ احساس کو شعور کا جزو بنانے کے لئے ضروری ہے کہ تبدیلی کی ابتدا فکر ونظر سے ہو۔ عام آدمی کو بھی یہ سمجھایا بتایا جائے کہ خدا کا مطلب خود فریبی نہیں بلکہ اس کے قوانین کی اطاعت ہے۔ اور اس کے یہ قوانین کائنات' معاشرے اور فرد کی ذات میں یکساں حیثیت سے نافذ العمل ہیں۔ کہیں بھی ان قوانین میں تعطل یا استثناء نام کی کوئی چیز نہیں آتی' آ ہی نہیں سکتی۔ اگر اس نے اپنے قوانین کو تبدیل کرنا ہوتا تو کیا وہ انہیں حتمی صورت اور قطعی حیثیت میں اپنی آخری کتاب میں بیان کرتا؟ ممکن ہے اپنے صدیوں پرانے محلات کو زمیں بوس ہوتے دیکھ کر شاہانِ علم یہ فرمائیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے' وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ تو آپ ان سے بڑے ہی احترام کے ساتھ کہئے۔ ہاں بلاشبہ وہ قادرِ مطلق ہے' مگر وہ کسی قاعدے' قانون' ضابطے' آئین کے مطابق ہی نظامِ ہستی کو چلا رہا ہے۔ کیا اس کے قادرِ مطلق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ نظامِ عدل کی بجائے ظلم کے ''سسٹم'' کے مطابق بھی اسی طرح جب چاہے کائنات کو چلائے گا؟

اگر اس نے ایک ضابطہ جاری کر دیا ہے کہ فلاں فلاں رشتے حرام ہیں' ان سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ تو کیا معاذ اللہ وہ قیامت تک کبھی اس ضابطے کو توڑنے کے بارے ارادہ بھی کرے گا؟ نہیں وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس نے اگر انبیاء کے سلسلے کو اپنے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ پر ختم کر دیا ہے تو اب اس کی ''قدرت'' کے امتحان کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ کسی اور نبی کو مبعوث کرے؟ جو لوگ خدا کی ''قدرت'' کے دوسرے رنگ میں قائل ہیں' انہیں دوٹوک الفاظ میں پوچھیں' جناب! فرمائیں' محمد عربی ﷺ کو آخری نبی بنا کر' قرآن کو آخری کتاب قرار دے کر' اسلام کو آخری دین کا ٹائٹل دینے کے بعد وہ اب ان ضابطوں کو تبدیل کر سکتا ہے؟

ظاہر ہے کوئی صاحبِ ایمان کبھی ہاں میں جواب نہیں دے گا' تو پھر ان نکتوں سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جزا سزا کے ضابطے سے بچنے کے لئے یہ راہِ فرار تلاش کرنا ہماری اپنی فکری کجی ہے کہ وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ جس کو چاہے بغیر کسی وجہ کے جہنم میں پھینک سکتا ہے' جس کو چاہے بغیر کسی سبب کے جنت کا حق دار قرار دے سکتا ہے۔ نہیں میاں! وہ عادل ہے۔ وہ ظالم نہیں۔ اس نے جب خود کو عادل کہا ہے تو اسے ظالم ثابت کرنا (ہمارا یہ رویہ) ظلمِ عظیم ہے یا نہیں؟ لہٰذا آیئے اور ابھی سے ذہنی تبدیلی کے عمل کا حصہ بن جایئے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے خود اپنے فکر ونظر کو درست کیجئے پھر اپنے عمل کی گواہی لایئے اور پھر دیکھئے کیسے انقلاب آتا ہے!!!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شبیر احمد، فلوریڈا

حیاتِ پرویز

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
(اقبالؔ)

صاحبو! عظیم لوگ مر کے بھی زندہ رہتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کر دینے والے تو قرآن کی اتھارٹی کے مطابق زندہ رہتے ہی ہیں۔ ہم نے عظیم لوگوں کی حیاتِ جاوید کے بارے میں جو عرض کیا ہے اس کا تعلق نہ مقتولین فی سبیل اللہ سے ہے اور نہ تصوف کی پروازوں سے۔ عظیم انسان اپنے کارناموں، فکری انقلاب اور اپنے بلند آئیڈیل کی صورت میں زندہ رہتے ہیں۔ ان گنت افراد کے دلوں میں بھی زندہ رہتے ہیں جنہوں نے ان سے روشنی پائی۔ مزید وضاحت کے لئے ایک سادہ سا خوبصورت لیکن غور طلب شعر ملاحظہ فرمایئے:

اس کے پیالے میں زہر ہی کب تھا
ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

1970ء کی دہائی کی ابتداء تھی۔ آرمی میڈیکل کا نوجوان کیپٹن شبیر احمد کشمیر کے محاذ پر عین سرحد پہ مٹی کے ایک بنکر میں تعینات تھا؟ فرسٹ۔اے۔کے۔آر۔ایف (رجمنٹ) کے ساتھ۔ مٹی گارے کی بنی ہوئی چھوٹی سی کینٹین کے ساتھ ایک چھوٹی سی لائبریری موجود تھی۔ شبیر صبح صبح Sick Report یعنی چند بیمار فوجیوں کا علاج کر کے فارغ ہو جاتا تھا۔ علاقے کی بکھری ہوئی سویلین آبادی کو بھی علاج معالجے کی مفت اور کھلی اجازت حاصل تھی۔ پہاڑوں، چشموں، سرو کے درختوں کی اس خوبصورت وادی میں آئے ہوئے دوسرا دن تھا کہ اپنے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کی خاطر میں ٹہلتا ہوا مٹی گارے کی اس چھوٹی سی لائبریری میں چلا گیا۔ اگر وہ شاعر وہاں موجود ہوتے جنہوں نے کہا تھا ''خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر'' تو یقیناً بازی ہار جاتے۔ مٹی کی ٹوٹی پھوٹی بیرک میں کسی صاحبِ ذوق نے

سینکڑوں اردو اور انگریزی کتابیں جمع کر کے سلیقے سے رکھ دی تھیں۔ ذرا ہی دیر گزری تھی کہ میری نگاہ ایک نہایت دیدہ زیب کتاب پر پڑی ''شاہکار رسالتؐ'' اور چند لمحے کے لئے وہیں جم کر رہ گئی۔ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا کتاب پڑھتا ہوا اپنے بنکر میں آ گیا۔ پانچ منٹ میں ہی اندازہ ہو گیا کہ ''یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں''۔

بچپن ہی سے شبیر، علامہ اقبالؒ کا مداح تھا اور اس وقت تک مجھے ان کا اردو کلام ازبر ہو چکا تھا اور فارسی کلام کے خوبصورت مرغزاروں کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

رات کو لالٹین جلانے سے پروانوں کا اتنا ہجوم ہو جاتا کہ مطالعہ کرنا ممکن نہ رہتا لیکن کتاب اتنی زبردست تھی کہ میں دن بھر اسے پڑھتا اور رات کو سر تک کمبل اوڑھ کر ٹارچ کی روشنی میں مطالعہ جاری رکھتا۔ عالم یہ تھا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

صاحبو! انکساری سے عرض کرنا ہے کہ 14 اگست 1947ء کے دن پیدا ہونے والے شبیر احمد نے ''آج تک اردو، انگریزی، فارسی اور عربی کی ہزاروں کتابیں پڑھی ہیں لیکن آج بھی آپ مجھ سے پوچھیں کہ میری سب سے پسندیدہ کتاب کونسی ہے؟ تو میں کہوں گا ''قرآن کریم'' کلامِ اقبال اور شاہکار رسالتؐ''۔ یہ تھا میرا پہلا تعارف اس عظیم ہستی سے جنہیں ہم احترام کے ساتھ علامہ غلام احمد پرویز اور محبت کے ساتھ باباجی کہتے ہیں۔

شاہکارِ رسالتؐ نے قرآنِ کریم اور اقبالؒ کے طالبِ علم پر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ عمر عزیز کے پہلے سولہ سال کراچی میں گزرے تھے۔ حفیظ جالندھریؒ کے بھانجے میرے والد مرحوم تھے جو ہجرت کر کے کراچی میں اپنی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ 1963ء سے 1968ء تک میں لیاقت میڈیکل کالج جام شورو (سندھ) میں زیرِ تعلیم رہا۔ اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ کراچی اور سندھ کے شہروں میں کوشش بسیار کے باوجود علامہ پرویز کی کوئی کتاب دستیاب نہ ہوسکی۔ کسی سے درخواست کرتا تو وہ یا تو لاعلمی ظاہر کرتے اور صاحبانِ علم قسم کے لوگ نصیحت پر ٹرخا دیتے۔ بیٹا! پرویز صاحب کو نہ پڑھنا گمراہ ہو جاؤ گے۔ خیر صاحبو! تین دن میں ادھر کشمیر کی پہاڑیوں میں ''شاہکار رسالتؐ'' مکمل ہوئی ادھر سعودی فوج میں میڈیکل افسری کپتانی، میجری، کرنیلی کا آٹھ سالہ سفر شروع ہوا۔ وہ ماحول جہاں دین نہیں مذہب کے بازار پر مودودی صاحب چھائے ہوئے تھے لیکن صاحبو! آم کے بعد نیم کی نمولی کون کھاتا ہے؟ (ویسے نظریں جھکا کر اعتراف کرنے دیجئے کہ نیم کے یہ پتے تو ہم ابال اور چھان کر کالج کے زمانے میں غٹا غٹ پی چکے تھے۔)

ملک فیصل شہید بادشاہ کم اور قلندر زیادہ تھے۔ شاہی خاندان کا طبی عملہ خاندان کی طرح وسیع تھا۔ ایک نئے نویلے چھبیس سالہ میجر ڈاکٹر کی حیثیت سے میں نے مردِ قلندر کو پہلی بار روبرو دیکھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ مجھ جیسے نوجوان قرآنِ کریم کو بلاواسطہ سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ ہم جوانوں کو دیکھ کر ملک فیصل شہید صوفے سے اٹھ کر فرش پر

بیٹھ جایا کرتے تھے۔ بہت سے سعودی انہیں ''یا فیصل'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بہت کم بولتے تھے لیکن ان کا ہر ارشاد قرآنِ کریم کا قولِ سدید ہوتا تھا۔ ان کے وجود میں کچھ ایسا جلال تھا جو پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔ علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی مکمل تفسیر تھے وہ: ؎

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صاحبو! اسی سال عرب اسرائیل جنگ 1973ء ہوئی۔ شبیر کو کچھ عرصے کے لئے اردن اسرائیل کی سرحد پر بھیج دیا گیا۔ قلندر بادشاہ نے اہلِ مغرب کا حقہ پانی بند کر دیا۔ تیل کی ایسی ناکہ بندی جو اہلِ امریکہ و یورپ آج تک بھول نہیں سکے۔ جب امریکہ میں پڑھنے والے ان کے ہم نام بھتیجے فیصل نے مغربی مصلحتوں کے تحت ملک فیصل کو فیصل شہید بنا دیا تو بے اختیار میرے منہ سے یہ شعر ادا ہوا۔ ؎

'قم باذن اللہ' کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

ملاقاتوں کے ایک مختصر سے دور میں فیصل شہید شفقت لیکن دبدبے کے ساتھ نصیحت کیا کرتے تھے۔ ''قرآن کو ہمیشہ قرآن سے سمجھا کرو۔ ریاض کے گرد اور مشرقی صوبے ربع الخالی کے خانہ بدوش بدوؤں سے ملا کرو''۔ اہل خانہ کے ہمراہ عرب میں ہمارا قیام آٹھ برس تک رہا۔ عربی زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی اور لغتِ قرآن بھی آہستہ آہستہ دل و دماغ میں جذب ہونے لگی۔ اتنے طویل قیام میں ''شاہکار رسالتؐ'' ذہن سے محو نہ ہو سکی۔ پاکستان آنے جانے والوں سے جب بھی علامہ پرویزؒ کی کتابوں کی فرمائش کی تو وہ خالی ہاتھ ہی لوٹے۔ کسی کو نایابی کی شکایت اور کسی کو کسٹمز کا اندیشہ۔ کتابوں کا ایک سیٹ تو ریاض ایئر پورٹ پر دھر لیا گیا۔

1979ء میں ہم پہلی بار امریکہ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ بچوں کی تعلیم یہاں بہت بہتر تھی اور اپنے پروفیشن میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ وطنِ عزیز پاکستان میں اس وقت مولوی صدر ضیاء الحق کا دورِ حکومت تھا۔ جو تھوڑا بہت علم زندگی میں حاصل کیا تھا اسے عوام و خواص تک پہنچانے کے لئے 1990ء میں اپنا ماہنامہ ''کہکشاں'' اردو میں اور "Galaxy" انگریزی میں جاری کیا۔ ہماری صاحبِ ذوق بیگم اس ماہنامے کی ترتیب و آرائش میں دل سے حصہ لیتی رہیں اور عنقریب اس ماہنامے کے شائقین بہت سے ملکوں میں سامنے آئے۔ امریکہ، کینیڈا، یورپ اور انڈیا کے چند اخباروں کے علاوہ ''فیملی میگزین'' لاہور میں میرا ہفتہ وار کالم ''دستک'' باقاعدہ شائع ہونے لگا۔ ''دستک'' آج بھی جاری ہے البتہ دس سال تک ''فیملی میگزین'' میں شائع ہونے کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ اس لئے کہ مدیر صاحب کی نظر میں کالم کی مقبولیت خطرے کی سرحدوں کو پار کر چکی تھی اور انہیں کالم میں علامہ جی اے پرویزؒ کے قلم کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔

آیئے! ذرا نو سال پیچھے چلتے ہیں۔ 1995ء کی ایک شام ہمارے ایک نہایت محترم دوست پروفیسر محمد الیاس صاحب اہلِ خانہ کے ہمراہ ڈنر پر تشریف لائے۔ نہایت

سنجیدہ اور پروقار محمد الیاس صاحب تحصیل کھاریاں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں فلوریڈا کی ایک بلند نام یونیورسٹی میں چیئرمین ہیں۔ رات کو جاتے جاتے وہ خاموشی سے ایک کتاب میز پر رکھ گئے۔ وہ تو چلے گئے۔ میں نے جب کتاب اٹھا کر دیکھی تو وہ تھی ''مطالب الفرقان'' جلد چہارم۔ ''ادارہ طلوع اسلام'' اور پرویز صاحبؒ کا نام دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوگیا۔ آناً فاناً پچیس صفحے پڑھ ڈالے۔ رات کافی ہو چکی تھی لیکن میں انتظار نہ کر سکا۔ پروفیسر صاحب کو فون کیا کہ یہ تو وہ خزانہ ہے جس کی تلاش میں برسوں سے شبیر سرگرداں تھا۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل تجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل تجھے

پروفیسر صاحب میرا ذوق وشوق دیکھ کر نہال ہو گئے اور انہوں نے مجھے بزمِ طلوع اسلام کینیڈا کا فون نمبر عنایت فرمایا۔ اگلے ہی روز شاہد خان صاحب سے گفتگو ہوئی۔ جی بھر کے داستانِ دل انہیں سنائی پھر ان کی محبت اور دریا دلی نے حیران کر دیا! میں نے کتابوں کے پورے سیٹ کی فرمائش کی۔ خیال تھا کہ کریڈٹ کارڈ نمبر انہیں دوں گا یا چیک ڈاک کے حوالے کروں گا پھر وہاں سے کتابیں آئیں گی۔ لیکن امریکہ اور کینیڈا کے دستور سے ہٹ کر ان کی پالیسی نرالی تھی۔ شاید اس لئے کہ اگر ان کا کوئی بزنس تھا تو وہ رب ذوالجلال والاکرام کے ساتھ تھا۔ کہنے لگے کتابیں کل کی ڈاک میں روانہ ہو جائیں گی۔ ملنے پر قیمت ارسال کر سکتے ہیں۔

صاحبو! ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ علم و دانش کا وہ بے بہا خزانہ گھر میں سب کے سامنے پڑا تھا جس سے طلوعِ اسلام کے محترم قارئین بخوبی واقف ہیں۔ تیز رفتاری سے پڑھنے کی عادت بہت پرانی ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ بابا جی کی کتابیں پڑھنے والے کے لئے بہت ہی آسان Reader Friendly پائیں۔ جی چاہتا تھا کچھ دن مریضوں کی چھٹی کر کے اس خزانے سے فیضیاب ہوا جائے جو خالقِ کائنات کے ارشاد کے مطابق ان سب چیزوں سے بڑھ کر انمول ہے جنہیں تم جمع کرتے ہو۔ ایک کتاب ختم ہوتی تو دوسری تھام لیتا اور پھر تیسری۔ راتوں کی نیندیں مختصر ہوگئیں۔ دو دون ٹھہر کر شاہد خاں صاحب سے پھر رابطہ ہوا۔ ان کے بھائی راحت خاں صاحب اور جناب عبدالرشید قریشی صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ صاحبو! آتشِ شوق تیز ہوگئی اور بہت بڑھ گئی جب شاہد خاں صاحب نے فرمایا کہ بزم کے پاس باباجیؒ کے آڈیو، ویڈیو کیسٹ بھی دستیاب ہیں۔ آئندہ چند دنوں میں ہر کیسٹ ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ الحمدللہ رب العالمین!

جلد ہی میں نے اپنے قارئین کے وسیع حلقے میں اس خزانے کا ذکر کرنا شروع کیا تو بزم کینیڈا کی مصروفیتیں ذرا بڑھ گئیں۔ یہاں پہنچ کر علامہ پرویزؒ کا سوزِ جگر اور سازِ دل یاد آتا ہے۔ اپنے ایک ویڈیو میں کتنی سادگی اور درد سے کہتے ہیں ''میں اپنی کتابیں خود ہی لکھتا ہوں اور خود ہی پڑھ لیتا ہوں''۔ کبھی فرماتے ہیں ''مغرب کے مفکر میرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اپنا ایک

پسندیدہ شعر دہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ ؎

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ
کوئی تو راہ میں پیچھے بھی آرہا ہو گا

بجا فرماتے تھے مجھ جیسے نہ جانے کتنے طالبانِ علم راہ میں پیچھے آرہے تھے۔ صاحبو! آج بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں جب بابا جی کا ارشاد از قرآن یاد آتا ہے ''ممکن ہے یہ پروگرام یہ مشن آپ کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے یا پھر پہلے ہم آپ کو وفات دے دیں''۔ ساتھ ہی ساتھ اس مردِ مومن کا اعتماد فضاؤں میں تیرتا ہوا دل میں اتر جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کا طالب علم کبھی مایوس نہیں ہوا کرتا۔

صاحبو! خود داری کے ساتھ انکساری انسان کی عظمت کی پہچان ہوا کرتی ہے۔ گزشتہ ہزار برس کا سب سے بڑا قرآنی مفکر زندگی بھر خود کو طالبِ علم کہتا رہا۔ ہر کتاب میں خصوصی طور سے ذکر کرتا رہا کہ فکرِ پرویزؒ حرفِ آخر نہیں۔ جو کچھ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں وہ محض ایک انسانی کوشش ہے جس میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ کبھی فرماتے ہیں۔ ''میں نے تو ایک دیا روشن کیا ہے۔ آنے والے افراد اس کی روشنی کو بڑھائیں گے''۔

علامہ پرویز ''بتیس دانتوں میں زبان کی طرح'' رہتے تھے۔ وطنِ عزیز کے گھٹے ہوئے فکری ماحول میں اور اس سے پہلے ہند میں یہ مردِ درویش قرآن سے جھاڑا کبیرا کرتا رہا۔ ہزار مولویوں کے فتوے لگے ہوئے ہیں۔ قوم ملائیت زدہ ہے اور تصوف کی ماری ہوئی۔ ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ان کا جہاد بڑا ہی عظیم جہاد تھا۔ ان کی جنگ اپنے دور کے سب سے بڑے مولوی کے ساتھ بھی تھی جسے ہم مُلّا ان چیف آف دی 20th سنچری کہتے ہیں۔ پرویز علیہ الرحمہ کا جہاد طاغوت کی ہر قوت سرمایہ داری' مذہبی پیشوائیت اور ایوانِ حکومت کے خلاف تھا۔ جبہ و دستار پہن کر علمائے کرام کہلانے والوں کے خلاف بھی اور عوام کی جہالت کے خلاف بھی۔

حق و باطل کے درمیان ہوتی آنے والی ہر نئی اور ہر پرانی کشمکش میں علامہ پرویزؒ دیوانہ وار میدانِ کارزار میں شمشیر زن نظر آتے ہیں اور اللہ انہیں ہر محاذ پر سرفرازی اور کامرانی عطا کرتا ہے۔

شبیر اور اس کی بیگم جب بھی بابا جی کا تذکرہ کرتے ہیں تو احترام و عقیدت کے ساتھ اور نم آنکھوں سے ایک بات ضرور کہتے ہیں۔ بارگاہِ خداوندی کا خاص کرم تھا کہ ان کے کٹر مخالفین اور جانی دشمنوں نے انہیں جینے دیا۔ سادہ لیکن صاف ستھرا لباس پہن کر وہ ہر ہفتے اپنے لیکچر کے لئے پبلک کے ساتھ پیش ہوتے۔ نہ کوئی پروٹوکول نہ سیکیورٹی۔ ہر خطرے سے بے نیاز! اپنے رب کے بھروسے پر وہ جرأت رندانہ کے ساتھ ہر بات کہتے جسے وہ حق سمجھتے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے کہ جنونی مذہبی جماعتوں کا کوئی چیلا 1960-1950ء میں قرآن کی اس بے مثال آواز کو خاموش کر دیتا تو دنیا کیسے انمول ہیروں' موتیوں' جواہر

پاروں اور خزانوں سے محروم رہ جاتی۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اللہ کریم نے باباجی کو بولہبی کا شکار ہونے سے بچا لیا۔ بہت سے احباب کی نظر اس جانب بھی گئی ہوگی کہ علامہؒ اردو کے بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ ان کی نثری سجاوٹ کی بلندی تک پہنچنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا علامہ اقبالؒ کے شعری ہمالہ تک۔ قلم ہاتھ میں لیتے ہیں تو گویا موتی پروتے ہیں۔ روانی' سلاست' الفاظ کا چناؤ' جملے' پیراگراف' صفحات پڑھتے چلے جایئے۔ ایک مترنم ندی شفاف بہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ صاحبو! روشنی کی قدر اندھیرے سے ہوتی ہے۔ دن پہچانا جاتا ہے تو رات سے اور سفیدی خوب چمکتی ہے تو سیاہی کے پس منظر میں۔ باباجی کو مرزا غالبؔ کا ایک شعر بہت پسند تھا جسے وہ بار بار پیش کرتے ہیں۔ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

سیاہی کے پس منظر میں چمک اور کثافت کے آگے لطافت دیکھنی ہو تو احمدیوں کے ''سلطان القلم'' یا ملاان چیف کی تحریروں کا کوئی ایک صفحہ کہیں سے پڑھ ڈالئے اور پھر باباجی کی چند سطریں ملاحظہ فرمایئے۔ آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ چچا غالبؔ دراصل کیا فرما گئے تھے۔

ایک اور پہلو پر توجہ فرمایئے۔ عام اصول ہے کہ معیار اور مقدار یعنی Quality اور Quantity دونوں کو خوبی سے چلانا مشکل ہوتا ہے۔ علامہ پرویزؒ نے بہت لکھا اور نفیس لکھا۔ آپ ان کی کسی کتاب میں یا چند صفحات میں بھی جھول نہیں پائیں گے۔

صرف دو افراد ایسے ہیں جن کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک نہیں بہت سی زندگیاں گزار کر دارِفانی سے رخصت ہوئے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے موجد تھامس ایڈیسن کا موسم سرما کا مکان ہماری ریاست فلوریڈا ہی میں ہے۔ اس عظیم انسان کے کام دیکھئے ہزار سے زیادہ ایجادات پر نظر ڈالئے یوں لگے گا جیسے اس کی زندگی کے ہر دن میں چوبیس نہیں چوبیس سو گھنٹے ہوتے تھے۔ باباجی جو کارنامے انجام دے گئے ہیں ان کا صرف طائرانہ جائزہ لینے سے انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے بیاسی برس کی عمر پائی؟ یا 82 سو برس کی! آج بھی وڈیو دیکھئے تو ان کے لیکچر میں صرف پچاس سے اسی (80) تک خواتین و حضرات نظر آتے ہیں لیکن مثل مشہور ہے عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ علامہؒ کو قرآن سے اور حضور اکرمﷺ سے والہانہ عشق تھا اور ان کے پیغام میں مشک سے زیادہ مہک تھی۔ ہزار مخالفتیں اس خوشبو کو روکنے میں ناکام رہیں۔

جی چاہتا ہے علامہؒ آج زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کا خونِ جگر کیا خوب رنگ لایا ہے۔ ان کی زندگی میں اگر ہزاروں یا چند لاکھ مداح تھے تو آج دنیا بھر میں ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی ہے۔ یاد کیجئے ان کا قول جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتا تھا ''عزیزانِ من! قرآن ہے قرآن''۔ دیئے سے دیا جلتا گیا اور روزانہ نئے دیئے روشن

ہو رہے ہیں۔ نوجوانی میں ہم نے ملک فیصل شہید کا جو ارشاد سنا تھا ''قرآن کو قرآن سے سمجھو'' عرب کے صحرا نشینوں کے پاس بیٹھا کرو۔ اسی رمز پر علامہ پرویزؒ نے اپنے مداحوں اور طالبانِ علم کو رواں کر دیا۔ صاحبو! آج حسبنا کتاب اللہ کی آواز مشرق و مغرب میں گونج رہی ہے۔ دیگر بہن بھائیوں کی طرح شبیر احمد نے بھی قرآنی فکر کو حسبِ توفیق آگے بڑھایا ہے۔ اپنا ہی شعر عرض ہے:

چراغِ راہ گزر گُل ہوئے تو کیا غم ہے
تم آج اپنی نظر کے دیئے جلا کے چلو

برصغیر میں آباد قرآنی فکر رکھنے والے احباب شاید یہ سن کر حیران ہوں کہ اب امریکہ' کینیڈا اور یورپ ہی نہیں آسٹریلیا' ساؤتھ افریقہ' نیوزی لینڈ' ملائیشیا' انڈونیشیا اور جاپان تک میں فکرِ قرآنی کے ان گنت حلقے قائم ہو چکے ہیں۔ ستمبر 2001ء ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے کے بعد دو مخالف لیکن متوازی رجحان دنیا میں چل رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت ایک جانب ہے تو دینِ حق کے بارے میں آگاہی کا شوق دوسری جانب۔ ذہنی سطح پر اور بحث اور ڈائیلاگ میں تعلیم یافتہ پادریوں کے آگے ہمارا مولوی تو کیا پی ایچ ڈی کی سند رکھنے والے قدامت پسند علماء ہر جگہ ہزیمت اٹھاتے ہیں۔ ایک طرف تو مخالفین موضوعہ احادیث کا سہارا لے کر آنحضرت ﷺ کے نام نامی کی توہین کرتے ہیں یا قرآن کے عجمی ترجموں پر اعتراضات اٹھاتے ہیں لیکن ان کا سب سے سادہ ہتھیار یہ ہوتا ہے کہ وہ!

(1) عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔

(2) ان کے معجزات بیان کرتے ہیں۔ تمثیلی رنگ میں نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ مفلوج اور اپاہج لوگوں کو بھلا چنگا کر دیتے تھے۔ پانی پر چلتے تھے۔ مٹی کی چڑیاں بنا کر ہوا میں زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ کوڑھی کو شفا بخشتے تھے۔ بدروحوں کو نکال دیا کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ!

(3) پھر پادری کہتا ہے دیکھو مسلمانو! تم مانتے ہو کہ مسیحؑ کو آسمانوں پر زندہ اٹھا لیا گیا۔

(4) تمہارا اس پر بھی ایمان ہے کہ مسیحؑ ایک بار پھر دنیا میں آئیں گے اور تمہارے حالات بھی وہی سنواریں گے۔ صاحبو! ہم نے ایسے بہت سے مباحثے' مناظرے دیکھے ہیں۔ ہمارا قدامت پسند مولوی ڈ بیٹر آئیں بائیں شائیں کر کے رہ جاتا ہے۔ بے چارہ اور کیا کرے؟ لیکن اب صورتحال بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ اخباروں' رسالوں' کتابوں' ریڈیو اور کہیں کہیں ٹیلی ویژن پر فکرِ قرآنی کے مغربی فرنگی نمائندے صاف کہہ دیتے ہیں کہ آقائے نامدارؐ کی شان میں جو گستاخانہ حدیثیں تم پیش کر رہے ہو یہ گھڑی ہوئی ہیں۔ اسلام کے دشمنوں کی سازش ہیں۔ وہ سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر 7 کا حوالہ دے کر بانگِ دہل کہتا ہے کہ کتاب اللہ میں پیغمبروں کے جن معجزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ آیات متشابہات ہیں۔ نابینا کو بینائی عطا ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اندھی پیروی کا شکار تھا وہ حق کی روشنی کو دیکھنے لگا۔ مردوں کے جی اٹھنے کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بے کیف' بے مقصد زندگی گزار رہے تھے انہیں صحیح معنوں میں جینے کا

ڈھنگ آ گیا۔ ایسی باتیں سنتے ہی پادری ہکا بکا رہ جاتا ہے اور مسلمان کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے۔

صاحبو! یہ ہے فکرِ قرآنی کا فیض! جو ایک عالم کو سیلاب کی طرح بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔ صرف پانچ برس انتظار کیجئے اور آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! یہی سبب ہے کہ ہم نے اس مضمون کا عنوان ہی ''حیات پرویزؒ'' رکھا ہے۔ جی ہاں! علامہؒ اپنی فکر میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اور عالمِ نو کی تشکیل کر کے تاریخ کے مؤثر ترین افراد میں شمار کئے جائیں گے۔ ۔

مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق وعبر

ٹی وی کے جواز وعدم جواز کی بحث

چند ماہ قبل بھارت کے سب سے بڑے دینی ادارے دارالعلوم دیوبند نے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں اسلامی چینلز سمیت ٹیلی ویژن دیکھنے کو مطلقاً ناجائز قرار دیا گیا۔ حسب توقع اس فتوے نے اچھی خاصی بحث کھڑی کر دی۔ فتوے سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں نے اس کو بے معنی قرار دیا جبکہ حامیوں نے ٹیلی ویژن چینلز کے ذریعے سے پھیلائی جانے والی بداخلاقی کی مذمت کی اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ مذکورہ فتوے میں دی گئی ہدایت کی سختی سے پابندی کریں۔

مذکورہ فتویٰ مفتی محمود الحسن بلند شہری نے جاری کیا تھا جو مدرسہ دیوبند کے ایک سینئر عالم ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ٹیلی ویژن دیکھنا ممنوع ہے کیونکہ یہ بذات خود سطحی تفریح کا ایک ذریعہ ہے' اس لئے مذہبی مقاصد مثلاً اسلامی پروگرام نشر کرنے کے لئے اس کا استعمال غلط ہے۔ فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ اسلام نے اپنے پیغام کو پھیلانے کے لئے واضح طریقے بتائے ہیں اور ٹیلی ویژن ان میں شامل نہیں ہے۔ فتوے میں قرار دیا گیا ہے کہ جو لوگ ٹیلی ویژن پر اسلامی پروگرام دیکھتے ہیں' ان کا مقصد محض تفریح ہوتا ہے' اس لئے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ اس سے گریز کرنا چاہئے۔

فتوے کے ناقدین میں سے ایک حلقے کا کہنا ہے کہ اس فتوے کا محرک کیو ٹی وی (QTV) کے نام سے کھلنے والا ایک نیا اور روز افزوں مقبولیت حاصل کرنے والا چینل ہے جس کو اب بھارت اور پاکستان میں لاکھوں ناظرین میسر ہیں۔ کیو ٹی وی روایتی بریلوی تصوف پر مبنی دین کی تصویر پیش کرتا ہے جو کہ بیشتر دیوبندی علماء کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ نیز اس میں علماء کے روایتی حلقے کے بجائے عوامی مقررین مثلاً پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد اور بمبئی کے ذاکر نائک کی تقریریں نشر کی جاتی ہیں' جو کہ باقاعدہ تربیت یافتہ میڈیکل اسپیشلسٹ ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چونکہ یہ دونوں مقرر غیر عالم ہیں' اس لئے دیوبندی علماء انہیں اپنی اتھارٹی کے لئے ایک بڑا چیلنج تصور کرتے ہیں۔ بنگلور کے

مقبول احمد سراج نے (اسلامک وائس' جنوری 2005ء) لکھا ہے کہ دورجدید کے اسلامی مبلغین نے' جو وسیع حلقے تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے ٹیلی ویژن استعمال کرتے ہیں' روایتی مذہبی علماء کے حلقے میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دی ہیں۔ سراج کا اصرار ہے کہ ''اس وجہ سے اس فتوے کو حقارت اور نفرت کے ساتھ مسترد کر دینا چاہئے جس کا یہ فی الواقع مستحق ہے''۔

فتوے کے پس پردہ اصل محرکات جو بھی ہیں' اس نے ٹیلی ویژن کے اسلامی جواز وعدم جواز نیز خود علماء کی اتھارٹی کے حوالے سے ایک بڑی بحث کا آغاز کر دیا ہے اور اردو پریس میں اس حوالے سے مخالف نقطہ ہائے نظر پر زوردار بحث جاری ہے۔ چند ماہ قبل 'اردو راشٹریا سہارا' کے نئی دہلی کے ایڈیشن (22 اگست 2004ء) میں اس فتوے کے بارے میں موافق ومخالف' دونوں قسم کے مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین میں فتوے کے حامیوں اور مخالفوں نے اسلامی اصطلاحات کے حوالے سے بحث کی۔ کچھ نے اس فتوے کو اسلامی لحاظ سے درست' جبکہ کچھ نے اسے اسلام کی ایک نہایت غلط تعبیر قرار دیا۔

فتوے کے ایک زبردست حامی دیوبند کے فارغ التحصیل مفتی اعجاز الرشید قاسمی ہیں۔ اپنے پرجوش مضمون میں انہوں نے اسلامی پروگراموں سمیت ٹیلی ویژن کو دیکھنا مسلمانوں کے لئے بالکل ممنوع قرار دیا۔ انہوں نے استدلال کیا کہ کوئی بھی فلم (بشمول ٹیلی ویژن کے اسلامی پروگراموں کے) عورتوں کی تصویریں شامل کئے یا اسے محض تفریحی سطح تک محدود کئے بغیر پُرکشش نہیں بنائی جاسکتی' جبکہ یہ دونوں باتیں غیراسلامی ہیں۔ انہوں نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ بہت سے دیوبندی علماء نے کہا ہے کہ چونکہ ٹیلی ویژن شیطانی کاموں کا مظہر بن چکا ہے' اس لئے مسلمانوں کو حتی الامکان اس سے دور رہنا چاہئے' ورنہ انہیں اخلاقی پستی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کا استعمال اسلامی تبلیغی مقاصد کے لئے ہوسکتا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ تمام مسلمانوں پر لازم ہے' لیکن یہ کام صرف اور صرف جائز ذرائع سے کیا جانا چاہئے۔ چونکہ ٹیلی ویژن ان کے بقول بالعموم غیراخلاقی پروگرام نشر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے' اور بنیادی طور پر ایک ذریعہ تفریح کی حیثیت رکھتا ہے' اس لئے یہ اسلامی دعوت وتبلیغ کا کوئی جائز ذریعہ قرار نہیں پاسکتا' چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر قسم کے' اسلامی یا غیراسلامی' پروگرام دیکھنے سے گریز کرنا چاہئے۔ چونکہ وہ ٹیلی ویژن کو بذات خود بداخلاقی کا منبع سمجھتے ہیں' اس لئے انہوں نے قرار دیا ہے کہ ٹیلی ویژن کے اسلامی پروگرام لازماً اسلام کی توہین کا ذریعہ بن رہے ہیں اور آخرکار یہ مسلم تشخص کو برباد کر کے رکھ دیں گے۔ اپنے مضمون کے اختتام پر انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''تمام دنیا کے مسلمان دیوبند کے فتاویٰ کا احترام کرتے ہیں'' اور یہ توقع ظاہر کی ہے کہ تمام مسلمان صدق دل سے ٹیلی ویژن کے خلاف اس فتویٰ کی تائید کریں گے۔

متنازعہ فتویٰ کی مزید تائید دارالعلوم دیوبند کے

نائب مہتمم مولانا عبدالخالق مدراسی نے کی ہے۔ انہوں نے مفتی اعجاز صاحب کے پیش کردہ دلائل کے علاوہ ٹیلی ویژن کے ناجائز ہونے کی ایک مزید وجہ یہ بیان کی ہے کہ اسلام میں تصویر سازی ممنوع ہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے انٹرنیٹ کو جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ انٹرنیٹ ''عام طور پر تصویروں سے پاک ہوتا ہے''۔ انہوں نے کہا ہے کہ جائز مقاصد کے لئے انٹرنیٹ استعمال کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ تصویریں استعمال نہ کی جائیں۔ چنانچہ خود دارالعلوم دیوبند کی بھی اپنی ویب سائٹ قائم ہے اور بہت سے دوسرے دیوبندی گروپ بھی آن لائن فتاویٰ جاری کرتے ہیں۔

اگرچہ دیوبندی علماء کی اکثریت اس متنازعہ فتویٰ کی حامی ہے، تاہم متعدد نوجوان دیوبندی فضلاء اس کے شدید ناقد ہیں۔ ایک عمدہ مثال انجمن فضلائے دارالعلوم کے ترجمان ''ترجمان دارالعلوم'' کے مدیر وارث مظہری کا لکھا ہوا طویل مضمون ہے۔ مظہری نے اس فتویٰ کی، جو ان کے نزدیک ناقص دلائل پر مبنی ہے، کھلم کھلا مخالفت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فتویٰ کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ ٹیلی ویژن بنیادی طور پر سطحی یا غیر اخلاقی تفریح کا ایک ذریعہ ہے اور اس لئے اسلامی طور پر ناجائز ہے۔ اگرچہ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ٹیلی ویژن کے بہت سے پروگرام اسی نوعیت کے ہوتے ہیں، لیکن ٹیلی ویژن جائز مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً خبروں اور معلومات کو نشر کرنا، خلاف اسلام پراپیگنڈہ کی تردید کرنا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی وضاحت کرنا، چنانچہ ٹیلی ویژن سے مکمل گریز اختیار کرنے کے بجائے، مسلمانوں کو نامناسب چینلز سے دور رہنا چاہئے اور ان کے علاوہ دیگر مفید چینلز سے بے جھجک فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اگرچہ مظہری خود مدرسہ دیوبند کے ایک تربیت یافتہ عالم ہیں، لیکن وہ ٹیلی ویژن کے خلاف فتویٰ دینے والے مفتی صاحب سمیت قدامت پسند علماء پر سخت تنقید کرتے ہیں کیونکہ وہ تبدیلی اور ترقی کے مخالف ہیں۔ ان کے خیال میں ٹی وی کے خلاف فتویٰ دراصل علماء کی جانب سے نئی ایجادات کی مخالفت کی ایک طویل روایت کا تسلسل ہے۔ وہ اس ضمن میں کئی مثالیں پیش کرتے ہیں، مثلاً انیسویں صدی کے سعودی علماء نے وال کلاک کو ''شیطانی آلہ'' قرار دیا تھا۔ اسی طرح ٹیلی فون اور وائرلیس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ شیطانی ایجادات ہیں اور ان سے آنے والی آوازیں غیر مرئی شیطانی طاقتوں سے استعانت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک دوسرے دیوبندی فاضل مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی نے فتویٰ کے خلاف وارث مظہری کے دلائل کی تائید کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی سازشوں کا سامنا ہے اور خلاف اسلام پراپیگنڈہ کی تردید اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے انہیں ٹیلی ویژن سمیت ابلاغ عامہ کے ذرائع کو لازماً استعمال میں لانا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹیلی ویژن تعلیمی مقاصد کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے، تاہم مسلمانوں کو غیر اخلاقی پروگرام دیکھنے سے گریز کرنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ٹیلی ویژن کو

مکمل طور پر برائی قرار دے کر اس فتویٰ نے مسلمانوں کو ساری دنیا کی نظر میں احمق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ٹیلی ویژن کو محض اس وجہ سے مکمل طور پر مسترد کر دینا کہ بہت سے ٹی وی پروگرام غیر اخلاقی ہوتے ہیں' ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹیاں بھی بند کر دی جائیں کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے بعض اداروں میں مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ہوتا ہے۔ انہوں نے تلخ لہجے میں مزید یہ تبصرہ کیا ہے کہ اگر فتویٰ نویس کی منطق مان لی جائے تو اسکی کیا وجہ ہے کہ اسی قسم کا ایک فتویٰ فلموں پر پابندی کے لئے بھی نہیں جاری کیا گیا جو کہ بداخلاقی اور فحاشی کو فروغ دے رہی ہیں؟

فتویٰ کے خلاف رائے دینے والے ایک اور دیوبندی فاضل مولانا اسرار الحق قاسمی ہیں' جو ایک وسیع حلقے میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اپنے مضمون میں انہوں نے تبصرہ کیا ہے کہ یہ فتویٰ حقیقی دنیا سے ناواقفیت پر مبنی ہے اور گزارش کی ہے کہ اس پر نظر ثانی کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر ایک ڈاکٹر ماہر فن نہیں ہے تو وہ مناسب دوا نہیں دے سکتا' بلکہ درحقیقت مریض کو اور زیادہ بیمار کر دے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ بعینہٖ یہی منطق اس صورت میں بھی لاگو ہوتی ہے جب علماء فتوے صادر کرتی ہیں۔ ٹی وی کے خلاف فتویٰ دینے والے عالم کی اتھارٹی کو چیلنج کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ''اگر کوئی عالم شریعت کی روح اور اس کے مقاصد میں رسوخ نہیں رکھتا تو اسے فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس کے جاری کردہ فتوے غلط اثرات مرتب کریں گے۔'' فتویٰ نویس کا نام لئے بغیر لیکن ان کی اور ان کی طرح کے دیگر علماء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ''نبی ﷺ کی ایک حدیث کے مطابق قرب قیامت میں ایک عظیم فتنہ برپا ہوگا اور علماء ایسے فتوے جاری کریں گے جو کہ قرآن اور سنت کے خلاف ہوں گے۔ وہ حد سے متجاوز فخر کی بنیاد پر ایسے امور پر گفتگو کریں گے جن کا حقیقی دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ وہ اقتدار یا دولت کے لالچ میں غلط فتوے دیں گے جو لوگوں کے لئے شدید مشکلات پیدا کریں گے۔ یہ سب کچھ اسلامی اصولوں کے خلاف ہوگا اور کشمکش اور خون ریزی پر منتج ہوگا جس کے لئے جاہل اور ناپختہ مفتی ذمہ دار ہوں گے۔ ایسے مسائل جن میں مسلمان تقسیم ہو جائیں اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگیں' مفتی کو فتویٰ جاری کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔''

مولانا انظر شاہ کشمیری نے' جو دارالعلوم (وقف) دیوبند سے وابستہ ایک ممتاز عالم دین ہیں' اس فتویٰ پر تنقید کی ہے کیونکہ یہ اسلام کو ایک غیر روادار' تنگ نظر اور ترقی و تغیر کے مخالف مذہب کے طور پر پیش کر کے اس کی بدنامی کا سبب بنا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ٹیلی ویژن کو جائز مقاصد مثلاً تعلیم' غیر اسلامی پراپیگنڈہ کی تردید اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ محض اس وجہ سے اس پر پابندی لگا دینا کہ یہ غیر اخلاقی پروگراموں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے' ایسے ہی مضحکہ خیز ہے جیسے یہ مطالبہ کرنا کہ ٹیلی فون پر پابندی لگا دی جائے کیونکہ وہ بھی اسی طرح غلط استعمال ہوتا ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ فتویٰ دور متوسط

کے علماء کے متروک اور ناقابل عمل خیالات پر مبنی ہے جو کہ فقہ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مسلمان علماء سے گزارش کی ہے کہ وہ آج کے دور کے تناظر میں اپنے فہم اسلام کو بہتر بنائیں اور اس میں ارتقاء پیدا کریں۔

ایک اور دیوبندی فاضل مفتی احمد نادر قاسمی نے کہا ہے کہ جائز مقاصد کے لئے ٹی وی کا استعمال درست ہے۔ چونکہ قرآن اور حدیث ٹیلی ویژن کے جواز یا عدم جواز کے مسئلے پر خاموش ہیں' اس لئے یہ مباح ہے بشرطیکہ اسے تعلیمی یا اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ بہت سے دیوبندی علماء کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ اسلامی پروگراموں میں تصویر کا استعمال بھی جائز ہے۔ تاہم مفتی احمد نادر قاسمی اور ٹیلی ویژن کے جواز کے حامی کچھ دیگر علماء ٹی وی دیکھنے کے لئے نہایت سخت اور بعض حالات میں ناممکن شرائط عائد کرتے ہیں۔ مثلاً مظاہر العلوم (وقف) سہارنپور کے مفتی محمد امین لکھتے ہیں کہ مسلمان ٹیلی ویژن دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ صرف ایسے اسلامی پروگرام دیکھیں جن میں تصویریں بالکل نہ ہوں۔ اگر سکرین پر کوئی تصویر آتی ہے تو ناظرین کو اپنی آنکھیں جھکا لینی چاہئیں' کیونکہ کسی تصویر کو دیکھنا اسلام میں ممنوع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے ٹی وی پروگرام جن میں عورتیں ہوں' چاہے وہ اسلامی ہوں یا غیر اسلامی' شریعت کے خلاف ہیں اور مسلمانوں کے لئے ممنوع ہیں۔ مزید برآں ٹی وی پر عورتوں کی آوازیں نہیں سنی چاہئیں کیونکہ ان کے بقول عورت کے جسم کی طرح اس کی آواز بھی پردے میں ہونی چاہئے۔ اسی طرح کی مشروط اجازت شاہی مسجد فتح پوری دہلی کے امام مفتی مکرم احمد نے بھی دی ہے جنہوں نے مذکورہ فتوے سے تو اختلاف کیا ہے' تاہم یہ کہا ہے کہ ٹی وی کے اسلامی پروگرام جائز ہیں بشرطیکہ وہ شریعت کے مطابق ہوں اور ان میں عورتوں کی تصویریں اور آوازیں نشر نہ کی جائیں۔ ہاں اگر ایسے پروگرام مردوں کی تصویریں دکھائے بغیر پیش نہ کئے جا سکیں تو ضرورت کے تحت وہ اسے جائز تسلیم کرتے ہیں۔

دہلی کے مولانا وحید الدین خان' جو اپنے نسبتاً لبرل خیالات کی وجہ سے قدامت پسند علماء میں سخت ناپسند کئے جاتے ہیں' غضب ناک حد تک اس فتوے کے خلاف ہیں اور انہوں نے اپنے مضمون میں فتویٰ نویس کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ مسلمانوں کو غیر اخلاقی پروگرام دیکھنے سے باز رہنا چاہئے' تاہم وہ تعلیمی مقاصد' خلاف اسلام پراپیگنڈہ کے مقابلہ اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے ٹی وی کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک ذریعہ ابلاغ کے طور پر ٹی وی' اخلاقی لحاظ سے غیر جانبدار ہے۔ یہ اچھے مقاصد کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے اور برے مقاصد کے لئے بھی' اور علماء سمیت مسلم قائدین کو اس کے منفی پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے مناسب اسلامی پروگرام بنانے پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے۔ انہوں نے اس ضمن میں پیغمبرانہ مثالیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ محمد ﷺ نے مکہ میں کعبہ کو دعوت اسلام کے لئے استعمال کیا جبکہ اس وقت کعبہ میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ پیغمبر نے بتوں کو نظرانداز کر دیا اور اپنے دعوتی مشن کو جاری رکھا۔ اسی طرح مسلمانوں کو

غیر اخلاقی ٹی وی چینلز اور پروگراموں کو نظر انداز کر کے اسے اسلامی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹی وی دشمنانِ اسلام کی کوئی خفیہ سازش نہیں جس کا مقصد مسلمانوں کو مغلوب کرنا اور غیر اسلامی پراپیگنڈہ پھیلانا ہے، جیسا کہ بہت سے علماء دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ خدا کی ایک نعمت، اس کی قدرت کا ایک اظہار اور خدائی قوانین کا ایک استعمال ہے۔ مولانا وحید الدین کہتے ہیں کہ ٹی وی کا امکان خدا کی تخلیق میں پوشیدہ تھا یہاں تک انسانوں نے اسے دریافت کر لیا۔ اس لئے اسے مکمل طور پر حتیٰ کہ اسلامی مقاصد کے لئے بھی ناجائز قرار دینا، جیسا کہ فتویٰ نویس نے کہا ہے، ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

مولانا وحید الدین کے موقف کی تائید نئی دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر اختر الواسع نے بھی کی ہے۔ انہوں نے ٹی وی کو مکمل طور پر غیر اسلامی قرار دینے والے فتوے سے اختلاف کرتے ہوئے اصرار کیا کہ اسلامی لحاظ سے درست پروگراموں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک ٹی وی کا غیر اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال ہونا اس کو بطور ایک آلے کے غیر اسلامی نہیں بنا دیتا۔ وہ تلخ لہجے میں کہتے ہیں کہ اگر اس منطق کا اطلاق ہر جگہ پر کیا جائے تو کاغذ اور قلم کو بھی ناجائز قرار دینا پڑے گا کیونکہ یہ بھی ہر قسم کے غیر اسلامی خیالات کو پھیلانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ ان کی رائے میں ٹی وی کے غیر اخلاقی پروگراموں کے مسئلے کا حل یہ نہیں کہ ٹی وی پر ہی مکمل پابندی لگا دی جائے، بلکہ یہ ہے کہ ان کی جگہ پر بہتر پروگرام پیش کئے جائیں۔ مزید برآں وہ لکھتے ہیں کہ ٹی وی کے اسلامی پروگراموں پر پابندی لگانا اسلامی نقطہ نگاہ سے الٹا منفی نتائج کا باعث بنے گا، کیونکہ ان پروگراموں کے ذریعے سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ آگاہی حاصل کر رہی ہے۔ اگر ان کو بھی ممنوع قرار دیا جائے جیسا کہ فتویٰ کا مقصد ہے تو واحد نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ان پروگراموں کی جگہ غیر اخلاقی پروگراموں کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیں گے۔

اسلامی بنیادوں پر فتویٰ کو ہدف تنقید بنانے کے علاوہ اس بحث کے کچھ شرکاء نے یہ دلچسپ سوال بھی اٹھایا ہے کہ فتویٰ نویس اور ان کے حامیوں کے ہاں دوہرا معیار پایا جاتا ہے۔ مثلاً انجمن فضلائے دارالعلوم دیوبند کے قائم مقام صدر مولانا عمید الزمان قاسمی کیرانوی نے بڑی جرأت سے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ فتویٰ کی رو سے ٹی وی کو ناجائز قرار دیئے جانے کے باوجود متعدد دیوبندی علماء باقاعدہ ٹی وی پر آتے ہیں اور ٹی وی پر اپنے جلوسوں کی منظر کشی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح اتر انچل کی ملی کونسل کے کنوینز مولانا ریاض ندوی ٹی وی کو مکمل طور پر ناجائز قرار دینے جبکہ انٹرنیٹ کے استعمال کی اجازت دینے کے موقف میں شدید تضاد محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات یقینی ہے کہ غیر اخلاقی مواد نہ صرف انٹرنیٹ پر زیادہ کثرت سے میسر ہے بلکہ ٹی وی کے برعکس، وہ کسی قسم کی سنسر شپ کے دائرے میں بھی نہیں آتا۔

فتویٰ کے حامیوں اور مخالفوں کی گرما گرم بحث

کے باوجود لگتا یہ ہے کہ عام مسلمانوں نے اسے سنجیدہ توجہ کا مستحق نہیں جانا، چنانچہ لوگوں کی طرف سے منظّم طور پر ٹی وی سیٹ توڑ دینے کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا، جیسا کہ چند برس پہلے پاکستان کے صوبہ سرحد میں دیوبندی کارکنوں نے کیا تھا۔ خود بہت سے مسلمان اہل علم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کے فتوے ایک وقتی بے چینی تو پھیلاتے ہیں لیکن ان سے کوئی مثبت مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ غطریف شہباز ندوی لکھتے ہیں (افکار ملی، نومبر 2004ء) کہ اسکے نتیجے میں صرف یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ مدارس کے مولوی حضرات عام طور پر جو فتوے جاری کرتے رہتے ہیں، ان کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ انہیں جدید دنیا کی پیچیدگیوں کا سرے سے کوئی اندازہ ہی نہیں۔

(http://www.islaminterfaith.org/april2005/)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاموش موازنہ

یایھا المدثر

1- اے بالاپوش اوڑھنے والے	(مولانا) احمد رضا خاں بریلوی
2- اے کپڑے میں لپٹنے والے	(مولانا) اشرف علی تھانوی
3- اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے	(مولانا) ابوالاعلیٰ مودودی
4- اے چادر لپیٹنے والے	پیر کرم شاہ صاحب
5- اے چادر اوڑھ کر سونے والے	(مولانا) ابوالکلام آزاد
6- اے لحاف میں لپٹنے والے	شاہ عبدالقادر
7- اے لحاف میں لپٹنے والے	حکیم یٰسین
8- اے چادر اوڑھنے والے	(مولوی) محمد علی لاہوری
9- اے کپڑا اوڑھنے والے	شاہ رفیع الدین
10- اے وہ کہ جس کے ذمے عالمِ انسانیت کو سنوار کر ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔ [اے وہ جس کے ذمے انسانیت کے سنوارنے کا فریضہ ہے] [اے وہ جو نوعِ انسانی کے معاملات کو حسنِ تدبیر سے سلجھانے آیا ہے]	غلام احمد پرویز

یایھا المزمل

1- اے جھرمٹ مارنے والے	(مولانا) احمد رضا خاں بریلوی

2- اے جھرمٹ مارنے والے	شاہ عبدالقادر
3- اے جھرمٹ مارنے والے	حکیم یٰسین
4- اے کپڑوں میں لپٹنے والے	(مولانا) اشرف علی تھانوی
5- اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے	(مولانا) ابوالاعلیٰ مودودی
6- اے چادر لپیٹنے والے	پیر کرم شاہ صاحب
7- اے کپڑا اوڑھنے والے	شاہ رفیع الدین
8- اے کپڑے میں لپٹنے والے	(مولانا) ابوالکلام آزاد
9- اے کپڑا اوڑھنے والے	(مولوی) محمد علی لاہوری
10- اے رسول! فریضۂ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد، تیرے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ تو ایسے رفقائے سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو تاکہ یہ کارواں شاداں و فرحاں منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتا چلا جائے اس قسم کا عملِ تزمیل سالار کارواں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔	غلام احمد پرویز

[اے امرِ عظیم اٹھا لینے والے! حُسن کارانہ انداز میں رفقائے سفر کا انتخاب کیجئے]

(مرتبہ: جیم الف عین)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

روشن خیال معاشرہ

ایمان کا واضح تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان دین کی محکومی پر تڑپ اٹھے اور اپنا سر دے کر بھی اسے غالب کر سکتا ہو تو دریغ نہ کرے، لیکن اس حالت سے پیشتر ہر مسلمان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دلائل و براہین سے یہ ثابت کرے کہ دین کے نظام سے بہتر دنیا میں کوئی اور نظام نہیں ہو سکتا اور دین کی روشنی کو دنیا میں پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کرے کیونکہ دین الٰہی سے زیادہ روشن درخشندہ اور روشن خیالی پر مبنی کوئی اور نظام نہیں ہو سکتا۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے۔ کتب انزلنه الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور (۱۴/۱)۔ (اے رسول) یہ قرآن وہ کتاب ہے جسے ہم نے تمہارے پاس اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آؤ۔ قرآن کریم نے حضورﷺ کی بعثت کا مقصد ہی یہ متعین کیا کہ حضورﷺ قرآن کریم کے ذریعے نوع انسانی کو ظلمٰت سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔ آیت کریمہ (۱۴/۵) کے مطابق ظلمت سے نور کی طرف لے آنے کا عملی مفہوم وہ ہے جو حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا۔ یعنی اس قوم کو انسانوں کی محکومی سے نکال کر خالص قوانین الٰہی کی اطاعت میں لے آئے۔ اس آیت کریمہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ نور کا لفظ بطور واحد کے استعمال ہوا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ظلمٰت کا لفظ جمع کے صیغے میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اندھیرے تو بے شمار ہو سکتے ہیں لیکن نور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ جو قرآن کریم کی تعلیمات کے ذریعے ہی فروغ پا سکتا ہے، کیونکہ قرآن کریم خود نور ہے۔

حضورﷺ جب مکہ میں مبعوث ہوئے تو وہ سخت تاریکیوں کا دور تھا۔ ہر طرف جہالت، بدامنی، افلاس، نسلی تفاخر، لوٹ مار، قتل و غارت گری زندگی کا معمول بن چکا تھا اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کا عنایت فرمودہ نظام بحیثیت دین اور ضابطۂ زندگی کے متمکن فرمایا اور ساری تاریکیاں دور کر کے معاشرہ کو وحی کے نور سے مستنیر فرمایا۔ دین خداوندی کا نظام روشن خیالی پر مبنی ہوتا ہے اور ہر طرح کی روشن خیالی اس میں جگہ پا لیتی ہے اور یہی صورت ہمارے ہاں صدر اول میں رہی لیکن مسلمانوں کی

بدقسمتی کہ دین کا نظام منقرض ہوگیا اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ چونکہ دین خداوندی میں ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں' اس لئے ملوکیت نے دین کا نظام درہم برہم کر کے' قرآن کریم کو بحیثیت مذہب کے برقرار و جاری رکھا اور اب دین کے بجائے مذہب کا تمکن ہو گیا۔ بدقسمتی یہ کہ احکامات تو ملوکیت کے جاری ہوتے رہے لیکن ان پر ٹھپہ اسلام کا لگتا رہا اور اس طرح اسلام مسلسل بدنام ہوتا چلا جاتا رہا۔ دین روشنی خیالی پر مبنی ہوتا ہے۔ مذہب تاریکیوں کا مجموعہ ہوتا ہے آج ہم مسلمان جن نظریات کے حامی و متبع ہیں وہ مذہب پر مبنی ہیں اور اسی سے ہم مسلمانوں کے سارے ممالک تاریکیوں سے پُر' پسماندہ' ذلیل و خوار ہیں۔ مسلمانوں کا اس حالت سے باہر نکلنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس مذہب کو جلد سے جلد ترک کر کے' دین کو بحیثیت نظام جاری کریں۔ مذہب کے فرسودہ قوانین کی' بیک جنبش قلم تنسیخ کر کے' موجودہ دور کے مطابق قوانین وضع کریں جن کا ماخذ صرف قرآن کریم ہو۔

ہم مسلمانوں کے موجودہ مذہب کا دارومدار حدیث و فقہ پر ہے۔ یہ وہ دو ستون ہیں جن پر ہماری پیشوائیت کی ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ چونکہ ان کا دارومدار ہی ان دو ستونوں پر ہوتا ہے' اس لئے وہ ان کو ترک کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ کچھ عرصہ بیشتر تک تو صرف مشرقی علوم کے واقف لوگ پیشوائیت کے زمرہ میں آتے تھے' لیکن اب انگریزی خواندہ حضرات بھی' جو موجودہ علوم سے خوب خوب واقف ہیں' وہ بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ پیشوائیت یا مولویت کا تعلق پیکروں سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک ذہنیت ہے۔ ہر وہ شخص جو حدیث کو وحی اور حجت قرار دیتا ہو اور فقہ کو غیر متبدل سمجھتا ہو' وہ پیشوائیت کا نمائندہ ہے اور نرا مولوئ محض ہے۔ خواہ اس کا لباس عمامہ' عبا' لمبے لمبے کرتے' اونچی اونچی شلواریں ہوں خواہ کوٹ پتلون اور ٹائی اور Bow ہو۔ لباس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل شے وہ ذہنیت ہے جو مذہب میں پیدا ہوتی ہے اور جب تک یہ مذہب کی ذہنیت' یعنی حدیث کی حجیت اور فقہ کی تقلید باقی رہے گی' ہمارا معاشرہ تاریک' رجعت پسند رہے گا اور یہ ایک روشن خیال معاشرہ نہیں بن سکتا۔

قرآن کریم پر مبنی روشن خیال معاشرہ (جو کہ دین خداوندی ہے) کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور اس میں انسان کی حکومت دوسرے انسانوں پر قطعاً حرام ہے۔ انسان' انسان سب برابر ہیں اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت و ترجیح نہیں ہے۔ ساری انسانیت قابل تکریم ہے۔ حکومت صرف اللہ کے قانون کی ہوتی ہے۔ وما اختلفتم فیه من شئ فحکمه الی الله (۴۲/۱۰) اور تم لوگ جس چیز میں بھی اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں ہر چیز کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق ہوگا' وہاں قرآن ہی کا نظام جاری ہوسکتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں قرآن کے مطابق فیصلے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اس آیت سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ ہم مسلمانوں پر قرآن کا نظام جاری کرنا فرض ہے' جب ہی تو

اس کے مطابق فیصلے ہو سکتے ہیں۔ حکومت خداوندی تو ایک ادارہ یا ایک ایجنسی ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کو جاری کرتی ہے۔ جو لوگ ان قوانین کو جاری کرتے ہیں وہ پہلے خود ان قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور پھر دوسروں سے ان کی اطاعت کراتے ہیں۔ نہ وہ خود حاکم ہوتے ہیں اور نہ ہی عوام ان کے محکوم ہوتے ہیں۔ دوسروں کو احکام پر عمل کرانے والے خود بھی ان قوانین کے محکوم ہوتے ہیں اور دیگر عوام بھی۔ اس حکومت میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ حضورﷺ حالانکہ خود سربراہ مملکت تھے لیکن اس کے باوجود تمام احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی (۶/۵۰، ۷/۲۰۳)۔ میرے پاس جو وحی کی جاتی ہے، میں اس کا اتباع کرتا ہوں۔ وانا اول المسلمین (۶/۱۶۳) اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔ اس میں تقدم زمانی اور تقدم کیفی دونوں شامل ہیں کہ حضور وحی کے احکامات کے سب سے زیادہ پابند تھے۔ وہ ہی معاشرہ بہترین معاشرہ ہوتا ہے جس میں ہر فرد قانون کا پابند ہو اور ہر شخص پر، خواہ وہ کسی حیثیت کا بھی ہو، قانون کا اطلاق برابر ہوتا ہے۔ قرآنی معاشرہ میں یہی صورت ہوتی ہے کہ ہر فرد قانون کا پابند ہوتا ہے اور صرف قرآن کریم کو سامنے رکھ کر معاشرہ کی ضرورتوں کے مطابق قانون وضع کرتے چلے جاتے ہیں۔ جو بھی وقت کا اقتضاء ہو قرآن کی حدود میں، اس کے مطابق قانون کی تشکیل کر دی جاتی ہے۔ اس معاشرہ میں سابقہ فرسودہ قوانین کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح معاشرہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور ترقی پذیر بھی رہتا ہے اور روشن خیال اور Liberal قوانین پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی حکمران طبقہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی طبقہ کو Privileges مراعات ہوتی ہیں اور نہ ہی کسی کو V.I.P. جیسا سلوک (Treatment) ملتا ہے۔ وزیراعلیٰ اور وزیراعظم کو زمین کے رقبہ جات یا قیمتی پلاٹس دینے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اور نہ ہی بینک کے قرضہ جات معاف (Write Of) کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

انسانی قوانین پر متفرع معاشروں میں ہمیشہ ایک طبقہ مفت خوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے قرآن کریم نے مترفین کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ جو معاشرہ کو آکاس بیل (Parasite) کی طرح کھائے جاتا ہے۔ اس میں جاگیردار، پیر، فقیر، مرید، مولوی، مُلانے، ذخیرہ اندوز، سب شامل ہیں۔ اس معاشرہ کا بیشتر حصہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاتا ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں خواتین کا بیشتر حصہ، جو عمداً تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے، سارا مذہبی طبقہ، جو دارالعلوم سے، بطور استاد و شاگرد وابستہ ہوتا ہے، سارے سیاسی حلقے، جو دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کرتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی Earning Member نہیں ہوتا۔ جو محنت کرتے ہیں وہ کاشتکار، کارخانوں کے مزدور، چھوٹے صنعتکار ہیں جو مشکل سے چند فیصد آبادی پر مشتمل ہیں۔ چونکہ زیادہ لوگ مفت خورے ہیں اس لئے مجموعی طور پر ملک کی آمدنی کم ہوتی ہے اور جو چند فیصد لوگ محنت کرتے ہیں وہ ہی سب سے پست تر طبقہ میں شمار ہوتے ہیں جن سے ان

کی کمائی غصب کر لی جاتی ہے۔ لیکن قرآنی معاشرے میں یہ بات نہیں چل سکتی۔ وہاں کا قانون یہ ہے کہ لیس الانسان الا ما سعٰی انسانوں کو صرف اس کا حق ہے جو وہ محنت سے کماتے ہیں۔ دوسروں کی کمائی پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ معاشرہ میں درجات کا تعین بھی اسی طرح ہوگا کہ ولکل درجٰت مما عملوا (۱۹/۴۶، ۶/۱۳۳)۔ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ اس میں جو شخص بھی محنت کرے گا، علمی، فکری، فنی مہارتیں حاصل کر لے گا اس کے مطابق اس کو مقام و مرتبہ دیا جائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ایک لڑکا جو بالکل نکما ہے جس نے کوئی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل نہ کی ہو اور نہ ہی کوئی ٹیکنیکل فن حاصل کیا ہو وہ اپنے والدین یا خاندان کی مدد سے اعلیٰ مقام حاصل کرے اور ایک غریب لڑکا، عمدہ تعلیم کے باوجود پست درجہ پر رہے۔ قرآنی معاشرہ جو روشن مستقبل کا ضامن ہوتا ہے، اس میں مراتب اعمال کے مطابق ملتے ہیں۔ اعمال کی بجا آوری یا محنت کے بغیر کوئی درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

جو معاشرہ خالص قرآن کریم کی ہدایت پر متشکل ہوتا ہے، جس میں تمام امور کے فیصلے قرآن کریم کے احکامات کے مطابق ہوتے ہیں، اور قرآن کا نظام اس میں جاری ہوتا ہے اس میں اتنی صلاحیت و لچک Flexibility ہوتی ہے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں جو معاشرہ قائم ہے وہ خالص مذہب کی اساس پر قائم ہے جس میں وہ سابقہ قوانین جاری ہیں جو ٹھیٹھ ملوکیت کے تراشیدہ ہیں اور موجودہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اسی لئے معاشرہ جامد Static اور رجعت پسند ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ملوکیت کے دور کے تراشیدہ اور اس دور کے مروج کردہ قوانین و عقائد میں عمداً تقدیر کے عقیدے کو خوب خوب فروغ دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ہماری پیشوائیت اور تمام مذہب گزیدہ طبقہ کا ئنات اور دنیاوی امور کے بارے میں منفیانہ انداز نگاہ ہو گیا ہے جو دنیا کی ہر چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ معاشرہ میں مزید تاریکی کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی جو چیز سم قاتل کا درجہ رکھتی ہے یہ ہے کہ ہمارا مروجہ اسلام، تصوف کے زیر اثر، حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کردہ علوم کو قابل اعتناء اور لائق اعتبار ہی نہیں سمجھتا۔ یہ نہ صرف کائنات کو باطل قرار دیتے ہیں بلکہ حواس انسانی کو علم کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتے۔ جس کے لئے صدہا اشعار اور اقوال پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
علم کا سودا مجھے مہنگا پڑا

ان کے نزدیک صرف وہ علم قابل اعتماد ہے، جس کے حاصل کرنے میں حواس خمسہ کا استعمال نہ کیا گیا ہو، اور جو ان کی اصطلاح میں ''علم لدنی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، لیکن افسوس کہ یہ علم موجودہ دور کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

روشن خیال معاشرہ میں کوئی طبقہ بھی جائز حقوق و مراعات سے محروم نہیں رہ سکتا۔ خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں ہمارے فقہی قوانین کو دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے جن میں

عورت کی جان کی قیمت مردوں سے نصف قرار دی گئی ہے۔ شہادت سے محروم کیا گیا ہے۔ محض شبہ کی بناء پر زدوکوب کی اجازت دی گئی ہے۔ بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ نان ونفقہ کے لئے چار ماہ دس دن کی مدت کا تعین ازخود کیا ہے' قرآن کریم میں اس کی کوئی قید نہیں ہے۔ زنا کے واقعات میں چار گواہ ضروری قرار دیئے ہیں جس کی قرآن میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ اور اسی طرح کے تمام قوانین جو ہماری فقہ میں متداول ہیں' ملوکیت و پیشوائیت کی آپس کی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ قرآن پر مبنی روشن خیال معاشرہ میں بھلا ان کا کیا کام؟ عورتوں کے بارے میں ہماری فقہ کے قوانین چونکہ بہت ہی فرسودہ ہو چکے ہیں' اس لئے اس دور میں ان کے خلاف اس قدر تحریری مواد مہیا کر دیا گیا ہے کہ اس تحریری مواد نے ان فرسودہ قوانین کی دھجیاں بکھیر کر رکھی دی ہیں۔ طلوع اسلام نے ہی اس کے لئے بہت کثیر تعداد میں مضامین و مقالات طبع کئے ہیں جن کا بہت مفید اثر نہ صرف عوام پر ہوا ہے بلکہ عورتوں سے متعلق N.G.Os نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ راقم سطور کا ذاتی تجربہ ہے کہ ان تمام N.G.Os میں طلوع اسلام کی شائع کردہ کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'' موجود رہتی ہے' جس میں عورتوں کے حقوق سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ N.G.Os وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں اس موضوع پر تحریر کرنے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ جن صاحبان کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ طلوع اسلام کا مہیا کردہ مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ یا ''طاہرہ کے نام خطوط'' کا مطالعہ فرمالیں۔

یہاں عورتوں کے حقوق کے بارے میں صرف دو نکات اصولی طور پر پیش کئے جاتے ہیں' جو موضوع کو کافی حد تک سمیٹ لیتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف و للرجال علیھن درجۃ (۲/۲۲۸)۔ اور عورتوں کی (مردوں پر) ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں' اور مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو باتیں نہایت غور طلب اور قابل تعریف وستائش ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق پر پہلے زور دیا اور اس کا تذکرہ کیا گیا اور مردوں کے حقوق بعد میں بیان فرمائے۔ حقوق کی یکسانیت کا بیان یوں بھی ہوسکتا تھا کہ ولھم مثل ما علیھم یعنی مردوں کے عورتوں پر بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق (ولھن) پر پہلے اصرار کیا ہے اور مردوں کے حقوق کا بیان بعد میں فرمایا ہے۔ یہ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم کس قدر باریک امور کا بھی لحاظ رکھتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایسا ابدی و سرمدی چارٹر Charter بیان کر دیا گیا ہے کہ جو اپنی جامعیت میں اپنی نوعیت کا بالکل منفرد ہے۔ اس میں اضافہ کرنے کے لئے مزید کسی بات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ چونکہ کمترین راقم سطور کے پیش نظر یہ احتیاط ہے کہ کوئی بات ایسی نہ رہ جائے

جس سے قارئین کرام کے دل میں کسی قسم کی خلش رہ جائے کہ یہ بات عمداً نظرانداز کردی گئی ہے' اس لئے آیت کریمہ کے آخری حصہ کے لئے بھی چند سطور تحریر کرنی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وللرجال علیھن درجۃ۔ اور مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری ہے۔ ہمارے علماء کرام Intellectual Dis-honesty کا ارتکاب کرتے ہوئے' اس آیہ کریمہ کے اس حصہ کو عمداً سیاق وسباق (Context) سے نکال کر ایک مستقل حکم کی حیثیت سے کہ مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری ہے' پیش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے۔ آیہ کریمہ ذرا طویل ہے آپ خود اپنے قرآنی نسخہ میں ملاحظہ فرما لیں کہ اس آیت میں طلاق و عدت کے احکامات بیان ہو رہے ہیں اور حمل کا تذکرہ تفصیل سے ہو رہا ہے کہ حمل کا تعین صحیح طریقہ سے ہونا چاہئے۔ قرآن کریم چاہتا ہے کہ یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ ہونے والا بچہ کس کا ہے۔ کس کی وراثت پائے گا' کون اس کا کفیل ہوگا۔ اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے لئے عدت گذارنی لازمی قرار دی ہے جو کہ مردوں کے لئے نہیں ہے اور یہی وہ درجہ اور یک گونہ برتری ہے جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف امر یا امر بالمعروف ونھی عن المنکر حکومت کرنے کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ یہ قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے' اس کے لئے آیات ۴/۲۲' ۴/۸۳' ۴/۵۴' ۴/۵۹' ۳/۱۵۴' ۳/۱۵۹' ملاحظہ فرمائیں۔ ان آیات کریمات میں اس اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر سورۂ نور کی یہ آیۂ کریمہ ملاحظہ فرمائیں والمومنون و المومنٰت بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں اور قرآن کی اصطلاح کے مطابق حکومت چلاتے ہیں۔ اس آیۂ کریمہ میں مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا مددگار بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد وہی امر بالمعروف ونھی عن المنکر دونوں کا فریضہ قرار دیا ہے۔ اس کام میں یعنی حکومت چلانے میں قرآن کریم نے دونوں کو شامل کیا ہے۔ چونکہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے اس لئے جب قرآن کریم کے مطابق عورتیں حکومت چلاسکتی ہیں تو (میری رائے میں) قرآن کریم کی رو سے وہ نماز کی امامت بھی کرا سکتی ہیں۔ فتدبروا۔

یہ دو آیات جن میں مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق اور عورتوں کا حکومت کرنے کا حق بیان کیا گیا ہے ان میں ہی اتنے حقوق آ جاتے ہیں کہ مزید حقوق بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جس زمانہ میں پاکستان اور ترکی میں بیک وقت دو خواتین وزیراعظم تھیں اس سال اخبارات کی خبر کے مطابق' انگلینڈ میں دس ہزار خواتین مسلمان ہوگئی تھیں۔ لیکن یہ سب حقوق اور اکرام و احترامِ نسواں دین میں ہوتا ہے' مذہب میں ان کی قطعاً کوئی گنجائش

نہیں ہے۔

ہمارے ہاں سیکولر سٹیٹ کے متعلق عام طور پر یہ تصور عام ہے کہ سیکولر سٹیٹ میں مذہب کو تو کوئی دخل نہیں ہوتا' لیکن یہ سٹیٹ لامذہب بھی نہیں ہوتی۔ جو لوگ سیکولر سٹیٹ میں مذہب کی پابندی کرنا چاہتے ہوں' وہ بے شک مذہب کی پابندی کر سکتے ہیں لیکن مذہب کو سٹیٹ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس میں سٹیٹ کی طرف سے یہ پابندی نہیں ہوتی کہ کوئی شخص مذہب کی رسوم ادا نہ کرے۔ ہمارے ہاں اخبارات اور ٹی وی چینلز میں سیکولر سٹیٹ کو اسی طرح سے Project کیا جاتا ہے۔ سیکولر سٹیٹ کی اصل تعریف (Definition) یہ ہے کہ سیکولر سٹیٹ وہ ہوتی ہے جس میں اکثریت کو ہر طرح کے قوانین بنانے کا اختیار ہوتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی پابندی خارج سے اس سٹیٹ پر Impose نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم جنس پرستی جیسا شنیع و مکروہ فعل اس میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اگر اس سٹیٹ میں چوری کو جائز قرار دینا ہو تو بے شک چوری جائز قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر اکثریت حقیقی بہن بھائی کا نکاح جائز قرار دے دے تو اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ البتہ اس میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق قوانین بنائے جاتے ہیں اور اس حد تک وہ معاشرہ روشن خیال ہوتا ہے۔

اس کے مدمقابل تھیوکریسی ہوتی ہے جس میں حکومت مولوی صاحبان کی ہوتی ہے۔ تھیوکریسی کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں خدا کے نام پر بنے بنائے' ڈھلے ڈھلائے قوانین جاری کئے جاتے ہیں۔ اس میں تقلید پرستی عام شیوہ ہوتا ہے اور دنیا کے امور سے عموماً منفیانہ Attitude لیا جاتا ہے۔ جو قوانین ہزار بارہ سو سال پیشتر علماء کرام نے بنا دیئے اس پر عمل پیرا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ حالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ موجودہ ضروریات کے متعلق قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں مسلمانوں میں بھی سابقہ قوانین کی تقلید ضروری سمجھی جاتی ہے۔ تھیوکریسی کا سارا دارومدار ہی سابقہ قوانین پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی تعلق موجودہ تقاضوں سے نہیں ہوتا' اور نہ ہی موجودہ تقاضوں کے مطابق اس میں قوانین وضع کئے جا سکتے ہیں اس لئے تھیاکریسی ایک تاریک ترین معاشرہ ہوتا ہے۔ فرقہ بندی' تعصب' دنیا سے نفرت' دنیاوی علوم سے بیزاری' ویڈیو' ٹی وی' وغیرہ سے کراہت' نفاق' مداہنت کا اس میں عام رواج ہوتا ہے۔

خالص قرآن کریم پر تشکیل کردہ معاشرہ (جس کو ہمارے ہاں عموماً تھیاکریسی سے Confuse کیا جاتا ہے) روشن ترین اور درخشندہ معاشرہ ہوتا ہے۔ اس میں صرف قرآن کریم کی مستقل اقدار کی پابندی لازم ہوتی ہے جو انسانیت کے ارتقاء میں ممد و معاون ہوتی ہیں اور جن کی پابندی سے آزاد ترین معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ان مستقل اقدار کی وضاحت فرما دی ہے۔ ان مستقل اقدار میں رہتے ہوئے' زمانہ کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے قوانین وضع کئے جاتے ہیں جن سے معاشرہ ہر دور میں جدید ترین Modern رہتا ہے اور قوانین میں فرسودگی ذرہ برابر نہیں آتی۔ نزول قرآن سے پیشتر تک

مذہب کا تصور انفرادی‘ نجی اور ذاتی تھا اور انسان اور خدا کا براہ راست تعلق عبادت کے ذریعہ قائم سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے اور اس کی حقانیت کی یہ واضح دلیل وشہادت ہے کہ قرآن کریم نے مذہب کا سابقہ تصور ہی بدل کر رکھ دیا اور یہ انقلابی تصور پیش کیا کہ انسان کا خدا سے براہ راست تعلق نہیں ہوسکتا بلکہ انسان کا خدا سے تعلق صرف اس نظام کے ذریعے ہوسکتا ہے جو اس نے وحی کے ذریعے قرآن کریم میں عطا فرمایا ہے۔ نزول قرآن کے وقت عرب شریف میں قبائلی طریقہ رائج تھا اور کوئی باضابطہ تصور نظام یا حکومت کا نہیں تھا۔ اس دور میں قرآن کریم کا ہی یہ مقام تھا کہ اس نے سٹیٹ کا تصور دیا اور اس سٹیٹ کی اطاعت کو ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا۔ اور صرف اس سٹیٹ کو ہی خدا اور بندے کے درمیان واسطہ قرار دیا۔ نزول قرآن کے بعد اگر کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کرنے کا خواہشمند ہے تو اس پر لازم ولابدی ہے کہ وہ قرآن کریم کا نظام قائم کرے اور اس نظام کی اطاعت کرے۔ اس نظام کی اطاعت سے ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر وہ نظام باقی نہیں ہے تو اللہ و رسول کی اطاعت کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی انسان کا کوئی تعلق اللہ تعالیٰ سے باقی رہتا ہے۔ فلہٰذا مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد‘ مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو‘ وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی‘ عاری‘ نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں۔

ہمارے علماء کرام یہ بات بکثرت دہراتے ہیں کہ اسلام میں دین و دنیا میں کوئی فرق نہیں لیکن فی الحقیقت یہ بات درست نہیں ہے۔ مذہب میں‘ مذہبی امور اور دنیاوی امور کو بالکل الگ الگ کر دیا جاتا ہے اور مذہبی امور کو صرف عبادات‘ رسوم اور نماز و روزہ وغیرہ تک محصور کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت کے ٹیکس اور زکوٰۃ بالکل جداگانہ چیزیں قرار پاتی ہیں۔ مذہبی جماعتیں اور سیاسی جماعتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ لیکن دین (جس کی اصل شکل یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کے قوانین جاری ہوں اور اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار دی گئی ہو) میں دین و دنیا کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ اس میں اسلامی حکومت کے Taxes ہی زکوٰۃ بن جاتے ہیں اور دنیا کا ہر وہ کام جس کا فیصلہ قرآن

کریم کے مطابق کیا جائے یا جس میں قرآنی حکومت کی اطاعت کی جائے وہ دینی کام ہو جاتا ہے۔ جو تاجر اپنے Taxes اسلامی حکومت کے قواعد وقوانین کے مطابق ادا کرتا ہے تو اس کا یہ دنیاوی کام دینی بن جاتا ہے۔ جو شخص اپنے دفتر اس لئے وقت کی پابندی سے جاتا ہے کہ وہ اس طرح قرآنی حکومت کی اطاعت کر رہا ہے تو اس کے دفتر جانے کا یہ عمل جو خالص دنیاوی ہے دینی بن جاتا ہے کیونکہ اس کو قرآنی حکومت کی اطاعت سے ثواب ہوتا ہے۔ اگر آپ کار چلاتے ہوئے ٹریفک لائٹ پر اس وجہ سے رک گئے ہیں کہ آپ اس سے اسلامی حکومت کی اطاعت کر رہے ہیں' تو آپ کا رکنا' ایک دینی کام بن جاتا ہے۔ اسلامی حکومت میں اس طرح دین و دنیا کی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور علامہ اقبال کا وہ مصرع منطبق ہو جاتا ہے۔

از کلید دین در دنیا کشاد

اور ہر وہ چیز جس کا تعلق اسلامی حکومت سے ہوتا ہے وہ شعائر اللہ میں شمار ہو جاتی ہے۔ مملکت کے محسوس علامات (Symbols) اس مملکت کے شعائر ہوتے ہیں۔ ان علامات کے احترام کے معنے اس مملکت کا احترام ہے۔ اسلامی حکومت کے شعائر اس حکومت کا قومی جھنڈا' ترانہ' کرنسی' اسلامی حکومت کی حدود و نفوذ' اسلامی حکومت کی طرف سے جاری کردہ پاسپورٹ' پوسٹل Stamps اور Judicial Papers الغرض ہر وہ چیز جو اسلامی حکومت کی طرف منسوب ہے وہ شعائر اللہ میں شمار ہوتی ہے۔ جس کا وقار و احترام سب شہریوں پر فرض ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت کی اطاعت ہی تقویٰ ہے اور جو یہ اطاعت کرتا ہے وہ متقی ہوتا ہے۔

قرآنی حکومت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں جرائم از خود ختم ہو جاتے ہیں اور خارج سے جرائم روکنے کی مشینری کی اتنی ضرورت نہیں رہتی۔ سیکولر سٹیٹ یا تھیا کریسی میں حکومت کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی خلاف ورزی یا جرائم کے ارتکاب سے اللہ و رسول کی نافرمانی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ بندوبست کر لے کہ وہ ارتکاب جرم کے بعد پکڑا نہیں جائے گا تو وہ جرم کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کیونکہ اس سے وہ اللہ و رسول کی کسی طرح کی نافرمانی نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص حکومت کا ٹیکس ادا نہیں کرتا تو وہ سٹیٹ کا مجرم ہے' اللہ و رسول کا مجرم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قرآنی حکومت کی تو نوعیت ہی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جو شہری سٹیٹ کی نافرمانی کرے گا وہ ساتھ ساتھ اللہ و رسول کا بھی مجرم ہوگا۔ اگر کوئی شخص دفتر کے اوقات کی پابندی نہیں کرتا تو وہ جس قدر دفتر میں اپنے افسران کو جواب دہ ہے اسی قدر وہ اللہ و رسول کی جناب میں بھی جواب دہ ہے۔ اگر کوئی شخص ٹریفک سگنل پر اس وجہ سے نہیں رکتا کہ وہاں کوئی سپاہی موجود نہیں ہے تو بے شک وہ پولیس کی گرفت سے تو بچ گیا لیکن وہ اللہ و رسول کے ہاں جواب دہ ہے۔ قرآنی سٹیٹ میں Sin اور Crime ایک ہو جاتے ہیں اور جو لوگ Sin نہیں کرتے وہ حکومت کی نافرمانی Crime بھی نہیں کرتے۔ اس طرح اس حکومت کے شہری از خود جرائم

کے ارتکاب سے ایک بڑی حد تک باز رہتے ہیں اور وہاں جرائم کو روکنے کے لئے خارج سے کسی فورس کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ شہریوں کو جرائم سے باز رکھے۔ اس حکومت میں حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔ ہر زمانہ کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' اس لئے یہ معاشرہ جرائم سے خالی اور روشن ترین معاشرہ ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے سورۂ فاطر کی آیات کریمات (۲۸' ۲۷) میں علماء کا لفظ ٹھیک سائنسدانوں کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ یہ آیات کریمات ذرا طویل ہیں آپ خود اپنے قرآن کریم کے نسخے میں ملاحظہ فرما کر کمترین راقم سطور کے خیال کی تصدیق فرما لیں۔ ان کے علاوہ بے شمار آیات وہ ہیں جو تسخیر فطرت' تسخیر ملائکہ سے متعلق ہیں جن میں یہ حکم کے طور پر لکھا ہے کہ مومن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرے۔ مومن کا فرض ہے کہ قوانین فطرت میں تحقیق کر کے' فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں قرآن میں عطا کردہ قوانین کے مطابق استعمال کرے۔ اس طرح انسان کی دنیا بھی سنور جاتی ہے اور آخرت بھی۔ اس موضوع پر اس قدر آیات کریمات موجود ہیں کہ ان کا احصاء بڑا دشوار ہے اور اس مختصر مضمون کا یہ موضوع بھی نہیں ہے۔ البتہ صرف دو تین آیات کریمات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) تخلیق کائنات کے متعلق متعدد جگہ پر ارشاد ہوتا ہے کہ کائنات کسی خاص مقصد کے لئے تخلیق کی گئی ہے خلق السمٰوت والارض بالحق۔ تعالیٰ عما یشرکون (۱۶/۳)۔ اس نے زمین و آسمان کو بطور ایک حقیقت کے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس نکتہ کو قرآن کریم بار بار تاکیداً دہراتا ہے۔ یہ اس نظریہ کی تردید ہے جس کی رو سے کائنات صرف سراب ہے اور جس نظریہ کو افلاطون جیسا مفکر' تمام ہندو فلاسفہ اور ہمارے ہاں کے وحدت الوجود کے قائل صوفیاء کرام درست خیال کرتے ہیں۔ یہ بیان ایجابی ہے' اسی کو تاکیداً سلبی طور پر فرمایا کہ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلاً۔ ذلک ظن الذین کفروا (۲۷/۳۸) اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں بے کار نہیں پیدا کیا۔ یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو کافر ہیں۔ کائنات کے متعلق مجموعی طور پر یہ بات ایجابی و سلبی طور پر دیا کہ کائنات کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اور انسانیت کے لئے کسی نہ کسی حیثیت سے نفع رساں ہے۔ جنہوں نے کفر کیا اور جن کا خیال ہے کہ کائنات باطل ہے ان کا تو کوئی فرض نہیں بنتا' البتہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ قرآن کے اس دعویٰ کو ثابت کریں کہ واقعاً کائنات کا ایک مقصد ہے۔ نیز یہ کہ کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کریں اور مسلسل تحقیق و تفتیش کے بعد ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کریں کہ یہ شے فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس کی تخلیق بیکار نہیں ہے۔ یہ کچھ ثابت کرنا قرآن پر ایمان لانے والوں کا فریضہ ہے اور عملاً ہر چیز کا

فائدہ ثابت کرنے سے قرآن کریم کا دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے اوراس کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری قابل غور آیۂ کریمہ یہ ہے وان مـن شئ الا عندنا خزائنہ' وما ننزلہ الا بقدر معلوم (۲۱/۱۵)۔ ہمارے پاس ان چیزوں کے بے بہا ذخیرے ہیں' لیکن ہم انہیں معینہ اندازے کے مطابق باہر لاتے ہیں۔

جس وقت نوع انسانی وجود میں آئی' اس سے پیشتر اس کی خوراک کا انتظام قدرت نے فرما دیا تھا۔ اول دن سے آج تک زمین نوع انسانی کو رزق فراہم کر رہی ہے اس میں رزق فراہم کرنے کی صلاحیت بے اندازہ ہے' لیکن رزق کی پیداوار اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ایک خاص اندازے سے ہو رہی ہے۔ اگر یہ زمین ایک مرتبہ ہی اپنے سارے ذخیرے باہر نکال دیتی تو آنے والی نسلیں رزق سے محروم ہو جاتیں' مزید یہ کہ طاقتور قومیں باہر سے آ کر زمین پر قبضہ کر کے' ایک دفعہ ہی اس کا سارا رزق نکال کر اس کو خالی کر دیتیں' اور مقامی لوگ اس سے محروم رہتے۔ جیسا کہ عرب ممالک میں آج کل پٹرول کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ ان قباحتوں کے پیش نظر قدرت کا انتظام ملاحظہ ہو کہ زمین سے رزق ''بقدر معلوم'' ہی مل سکتا ہے۔ ''بقدر معلوم'' میں اہم نکتہ یہ ہے کہ زراعت کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین میں جس قدر ریسرچ وتحقیق ہوتی جائے گی اور ان قوانین کے علم میں جس قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا' اسی قدر اضافہ ''بقدر معلوم'' میں ہوتا جائے گا' اور وہ یہی ''قدر معلوم'' ہوتا جائے گا اور اسی نسبت سے ارضی خزائن کی زیادہ نمود ہو جاتی جائے گی۔ سابقہ ادوار اور موجودہ دور کی پیداوار میں جس قدر فرق ہے وہ ان ہی قوانین کے معلوم کرنے اور ان پر عمل کرنے کا نتیجہ ہیں۔ پہلے ہمارے ہاں ایک ایکڑ زمین سے 8 من گہیوں آتا تھا' اب تقریباً اسی من گہیوں اسی رقبہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جو اقوام ''قدر معلوم'' میں اضافہ کرتی جائیں گے' اور اس کے مطابق زراعت کریں گی' ان کے ہاں اسی قدر رزق کی فراوانی ہوتی جائے گی۔

ان دو آیات کو خصوصی طور پر اس لئے یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ان دو آیات پر ہمارے مسلمان سائنسدان اپنی توجہ کو مرکوز رکھیں تو معاشرے میں رزق کی فراوانی ہونے کے علاوہ سائنسی تحقیقات کسی مقام پر بھی نہیں رک سکتی۔ ساری کائنات ان کی Laboratory ہو گی اور وہ کائنات کی ہر چیز کے لئے یہ ثابت کریں گے کہ اس چیز سے مسلمان فلاں فلاں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جس معاشرہ میں ریسرچ کا یہ معیار ہو' اور رزق کی فراوانی ''قدر معلوم'' کے مطابق ہو' اس سے زیادہ پرسکون اور روشن خیال معاشرہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟

قرآن کریم کے مطابق وحدت خالق کا لازمی نتیجہ وحدت مخلوق ہے۔ یعنی تمام انسانیت ایک عالم گیر برادری ہے۔ تمام نوع انسانی کی تخلیق ایک نفس واحدہ سے ہوئی ہے۔ ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ (۷/۱۸۹)۔ تمام انسان ایک ہی درخت کی شاخیں' ایک

ہی برادری کے افراد ہیں۔

بنی آدم اعضاء یکدیگر اند

اور مولانا حالی کا مشہور شعر ہے

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ھدیٰ کا
کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

قرآن کریم کا تو مقصود ہی یہ ہے کہ تمام انسانیت مل جل کے زندگی بسر کرے۔اس لئے بہترین معاشرہ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں اقلیتوں سے بہت ہی اچھا سلوک کیا جائے۔ انہیں ہر وہ سہولت فراہم کی جائے جو عام مسلمانوں کو حاصل ہو۔ان کی ملازمت‘ ان کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم‘ مذہب کی آزادی‘ رزق کی فراہمی‘ جان کی حفاظت‘ حکومت کا فرض ہے۔ قانونی معاملات میں ان کی شہادت تسلیم کی جاتی ہے۔قرآن کریم کی رو سے ان کی شہادت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ارشاد ہوتا ہے ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم (۵/۱۰۶) دو شخص معتبر چاہئیں تم میں سے یا دو اور ہوں تمہارے سوا۔اس آیہ کریمہ کے ذیل میں ’موضح القرآن‘ میں تحریر ہے کہ ’’اگر سفر میں لگا مرنے‘ وہاں مسلمان پیدا نہ ہوئے تو دو کافر بھی روا ہیں‘‘۔ انہیں پورے پورے انسانی حقوق مہیا ہوں گے۔ ان سے بالکل مسلمانوں کی طرح عدل کیا جائے گا۔ارشاد ہوتا ہے ولا یجرمنکم شنان قومٍ علی الا تعدلوا۔ اعدلوا۔ ھو اقرب للتقویٰ (۵/۸) اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو۔ (خبردار) تم ہر حال میں انصاف کرو‘ یہی پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔عدل کے علاوہ قرآن کریم نے ان سے حسن سلوک کا بھی حکم دیا ہے۔ ان تبروھم و تقسطوا الیھم (۶۰/۸) ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ عدل کرو۔ غیر مسلموں کو نہ صرف اپنی عبادت اور رسوم کی ادائیگی کی کھلی اجازت ہوگی بلکہ حکومت قرآنی کا فریضہ ہے کہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیر (۲۲/۴۰) اور اگر خدا ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دور دفع نہ کرتا رہتا‘ تو گرجے‘ اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوس کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے‘ کب کے ڈھا دیئے گئے ہوتے۔ان کی حفاظت کے علاوہ یہ بھی تاکید ہے کہ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم (۶/۱۰۹) یہ (مشرکین) جن کی اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) عبادت کرتے ہیں‘ انہیں تم برا نہ کہا کرو ورنہ یہ لوگ بھی خدا کو بے سمجھے عداوت سے برا (بھلا) کہہ بیٹھیں گے۔ ملک میں تو خیر ان کی حفاظت کرنی ہی ہے لیکن اگر وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلٰمہ اللہ ثم ابلغہ ما منہ ذلک بانھم قوم لا یعلمون (۹/۶) ان مشرکین میں سے (جن کے ساتھ معاہدات ختم کر دیئے گئے ہیں) کوئی تمہارے پاس آ کر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو پھر

اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ قوانین خداوندی کی رو سے اس نظام میں اس کی کیا پوزیشن ہوگی' اگر اس کو یہ پوزیشن قابل قبول نہ ہو' اور وہ مملکت سے چلا جانا چاہے تو تم اسے حفاظت کے ساتھ اس کی پناہ گاہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ جہالت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔

غیر مسلموں کے ضمن میں قرآن کریم میں جزیہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ جزیہ کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک مرتبہ سورہ توبہ میں آیا ہے' اس کے علاوہ یہ لفظ قرآن میں اور کہیں نہیں آیا۔ اس کے لغوی معنے عہد یا کسی خدمت کا معاوضہ ہیں۔ اصطلاحاً یہ وہ Tax ہے جو اسلامی حکومت ان سے ان کی حفاظت کرنے کے بدلے میں لیتی ہے۔ مزید یہ کہ غیر مسلموں سے زکوٰۃ بھی نہیں لی جاتی' اس لئے یہ جزیہ زکوٰۃ کا قائم مقام ہو جاتا ہے آیۂ کریمہ میں حتی یعطوا الجزیة عن یدو هم صاغرون آیا ہے (۹/۲۹) تاکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر' تمہارا غلبہ و حکومت اور تمہارا اقتدار تسلیم کر لیں (وهم صاغرون) اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا منظور کر لیں۔ لیکن موجودہ دور میں تو حالات ہی بدل گئے ہیں اور تمام اسلامی ممالک بشمول پاکستان میں غیر مسلم امن پسند شہریوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں کی طرح اسلامی ممالک کے قدیم و آبائی باشندے ہیں اور ان سے جنگ کے سے حالات بھی کبھی پیش نہیں آتے۔ اس لئے ان حالات میں جزیہ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور آج کل تو اس پر عمل کرنے کے متعلق سوچنا بھی بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے ملک کے غیر مسلموں سے بہت محبت سے پیش آئیں۔ ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح شمار کریں۔ ان کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کریں اور ہر ممکن سہولت ان کو فراہم کریں تاکہ ان کو بھی ملک سے محبت ہو اور ہماری محبت اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر وہ اسلام کی طرف راغب ہوں اور اس طرح ایک روشن خیال معاشرہ قائم کرنے میں ان کا حصہ بھی شامل ہو۔

قرآنی روشن خیال معاشرہ میں ہر شخص امن پسند Peaceful ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد حضورﷺ نے اپنے ان دشمنوں کو جنہوں نے ساری عمر حضورﷺ کو تنگ کیا' اور بالآخر مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا' کو معاف فرما دیا۔ حضورﷺ نے جس دن مکہ سے مدینہ شریف کی طرف ہجرت فرمائی تو چلنے سے ایک رات پیشتر کعبہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے کیونکہ حضور کو کعبہ چھوڑنے کا سخت رنج تھا۔ شیبانی' جو اس وقت کعبہ شریف کا کلید بردار تھا' اس سے حضورﷺ نے منت سماجت کی کہ وہ کعبہ کا دروازہ کھول دے تاکہ آپؐ کعبہ کی زیارت فرما لیں۔ لیکن شیبانی نے دروازہ نہیں کھولا اور حضورﷺ زیارت کئے بغیر ہجرت فرما گئے۔ فتح مکہ کے بعد کعبہ کی چابیاں اب خود حضورﷺ کے پاس تھیں لیکن آپؐ ان کو کسی کے سپرد کرنا چاہتے تھے تو حضورﷺ نے اعلان کرا دیا کہ میں کل یہ چابیاں کسی مناسب شخص کے سپرد کر دوں گا۔ صحابہ کرامؓ میں سے ہر کسی کی تمنا تھی کہ چابی انہیں ملے اور جب حضورﷺ نے چابیاں واپس کرنے کے لئے صحابہؓ کو جمع کیا تو ہر شخص ملتجی و ملتمس

نگاہوں سے آپؐ کو دیکھ رہا تھا کہ شاید اسے یہ چابیاں مل جائیں کیونکہ کعبہ کی کلید برداری ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ لیکن حضورﷺ نے یہ چابیاں اسی شیبانی کے سپرد کر دیں اور اس سے یہ بات فرمائی کہ اگر چہ تم نے تو مجھے ہجرت کے وقت زیارت سے محروم رکھا تھا لیکن آج میں یہ چابیاں تمہارے اس طرح سپرد کر رہا ہوں کہ قیامت تک یہ چابیاں تمہاری اولاد میں رہیں گی اور کوئی شخص تمہاری اولاد سے یہ چابیاں چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح حضورﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اس قدر دب کے صلح کی کہ تاریخ روایات کے مطابق صحابہؓ کی کثیر تعداد اس پر خوش نہیں تھی لیکن اس صلح کے نتائج اس قدر خوش گوار نکلے کہ وہی فتح مکہ کے پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ حضورﷺ کو یہی حکم تھا کہ جادلھم بالتی ھی احسن (۱۲۵/۱۶) قرآن کریم کی تبلیغ نہایت خوشگوار طریقہ پر فرمائیں۔ اس لئے حضورﷺ فرماتے تھے کہ ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی (۱۲/۱۰۸) میری راہ تو بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی راہ کی طرف دلائل و براہین کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ حضورﷺ کی یہی سنت ہے لیکن افسوس کہ آج یہ صورت نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کا وہ طبقہ جو سب سے زیادہ اتباع رسولؐ کا غل مچاتا ہے، وہ ہی سب سے زیادہ تشدد پسند ہے۔ حالانکہ تشدد کا طریقہ قرآن و سنت دونوں کے خلاف ہے، اور اس سے مسلمانوں کی تو ہے ہی، خود اسلام کی سخت توہین ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا حکم تو یہ ہے کہ فاعف عنھم واصفح (۵/۱۳) تم ان کے قصوروں کو معاف کر دو اور ان سے درگذر کرو۔ فاصفح الصفح الجمیل (۱۵/۸۵) ان (کافروں) سے شائستہ عنوان کے ساتھ درگذر کرو۔ نیز ارشاد ہوا واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً (۷۳/۱۰) اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور ان سے بعنوان شائستہ الگ تھلگ رہو۔ قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات حسنہ کی اپنے اندر نمود کریں اور علیٰ حد بشریت اپنے اندر ان کا انعکاس کریں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات 'المومن' اور 'السلام' بھی ہیں۔ اس سے مسلمانوں کو ان صفات کا اتباع کرنے کی وجہ سے ہر وقت امن و سلامتی کا داعی اور ان کو فروغ دینے والا ہونا چاہئے۔

ہم مسلمانوں کو روشن خیال معاشرہ تعمیر کرنے کے لئے دو باتوں کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے قوانین (جو فقہ اسلامی کہے جاتے ہیں اور جن کا صحیح نام فقہ ملوکیت ہونا چاہئے) اب بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اس فقہ ملوکیت کے جامد تصورات جو خاندانی سلطنتوں کے تقاضے پورا کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے، اس وقت کسی طور کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں عموماً اجتہاد پر زور دیا جاتا ہے، لیکن اجتہاد انہیں مردہ قوانین کی حدود کے اندر اندر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ اگر واقعاً جدید روشن خیال معاشرہ تشکیل دینا ہے تو ان قوانین کو بالکل دریا برد کر دیں۔

ان میں اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ صرف قرآن کریم کو سامنے رکھیں اور حالات کے اقتضاء کے مطابق قوانین وضع کرتے جائیں۔ اسی کے ذیل میں مذہبی علوم کے تدریسی نظام کی موجودہ علوم کی روشنی میں ازسرنو تدوین کریں۔ سابقہ قوانین تو جنازے اور لاشیں ہیں جن کو ہم کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔

دوسرے یہ سنت کا غلط تصور بدآج کل رائج ہے اس کو چھوڑ کر، صحیح تصور سامنے لائیں۔ حضورﷺ کے وہ اعمال جو آپؐ نے دین کی ترویج واشاعت اور اس کے تمکن کے لئے سرانجام دیئے، سنت ہیں۔ اس کے علاوہ حضورﷺ کے ذاتی معمولات جو آپ صبح سے شام تک سرانجام دیتے تھے، وہ سنت نہیں ہیں۔ اگر حضورﷺ کسی دن کوئی خاص کھانا تناول فرماتے تھے تو مدینے کی ساری آبادی وہ ہی کھانا نہیں کھاتی تھی کیونکہ وہ آپؐ کا ذاتی معمول تھا۔ ہاں علیٰ وجہ البصیرت دین کی دعوت دینا (۱۲/۱۰۸) حضورﷺ کا وہ عمل تھا جو آپ کی سنت ہے۔ ہمیں سب کو دین کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت دینی چاہئے۔ حضورﷺ نے اپنی سیرت طیبہ کو اپنی صداقت کی شہادت کے طور پر پیش فرمایا تھا فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہ افلا تتفکرون (۱۰/۱۶) یہ حضورﷺ کی سنت ہے۔ ہم سب کو اپنی سیرت اس درجہ پختہ رکھنی چاہئے کہ وہ دین کی اشاعت میں مددگار و معاون بنے۔ البتہ عقال باندھنا، اونٹ پر سفر کرنا، سنت نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس دور میں بھی ایسا لباس زیب تن فرماتے ہیں جس سے وہ بالکل کارٹون معلوم ہوتے ہیں اور بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حضورﷺ کسی Choas یا Void میں تولد نہیں ہوئے تھے۔ ان کے گرداگرد ایک معاشرت تھی جو عربی معاشرت تھی، اس معاشرت کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے علماء کرام نے عرب کے اس دور کی معاشرت کو دین بنالیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

عربی زبان کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف کے متعدد معنی ہیں مثلاً دین کے معنی ایک طرف غلبہ۔ اقتدار۔ حکومت۔ مملکت۔ آئین۔ قانون۔ نظم ونسق۔ فیصلہ۔ ٹھوس نتائج۔ جزاوسزا۔ بدلہ ہیں دوسری طرف قرآن میں یہ لفظ اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مذہب کا لفظ قرآن میں نہیں اس لئے دین کا ترجمہ ایک لفظ Religion سے کرنا صحیح نہیں ہے اور دین مذہب نہیں، آئین وقوانین خداوندی کے مطابق اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سابقہ انبیائے کرامؑ کی طرح دین خداوندی قائم Establish کیا تھا۔ آپ ﷺ چودہ لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی جنت بداماں، اللہ کی Kingdom جس میں خوف تھا نہ حزن، کی سنٹرل اتھارٹی تھے۔ حضورؐ اور صحابہؓ صرف وحی کا اتباع کرتے تھے اور لا الٰہ الا اللہ کا مطلب There is no Sovereign Except Allah لیا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد یہ نظام تقریباً نصف صدی قائم رہا۔ اس کے بعد مسلمان اپنے پچھلے پاؤں پر پلٹنے لگے۔ اقوامِ گزشتہ کے اتباع میں دین، مذہب میں اور خلافت، ملوکیت میں بدل کر اس کے زیر اثر کلمہ طیبہ کے جز کا ترجمہ There is no god but God کر کے قرآنی حکومت کا تصور ذہنوں سے مفقود کیا اور اللہ و رسولؐ کی اطاعت کو خدا کی پرستش تک محدود کر دیا۔

اسی طرح صلی اللہ علیہ وسلم O Allah prosper our efforts through his obedience اے اللہ ہماری کوششوں کو آپ ﷺ کی اطاعت کے ذریعے پروان چڑھا'' کو Peace be upon him سے بدلا گیا تاکہ قرآن کی عظیم آیت کریمہ میں اللہ کے حکم کا مفہوم تبدیل کر کے وارثین کتاب کو اس طرح ذکر وفکر صبح گاہی کے چکر میں ڈالا جائے کہ اس قوم پر قیامت تک دوبارہ شرع وآئینِ پیغمبر آشکارا نہ ہو سکے۔ خدا نے فرمایا تھا اے ایمان لانے والو! دل کی گہرائیوں سے

بطیّب خاطر اطاعت کرتے ہوئے میرے نبیؐ کی کوششوں کو پروان چڑھاؤ۔ صلوا علیه و سلموا تسلیما۔ جب ہم یہ کلمات کسی حضرت خطیب کے دہن مبارک سے سنتے ہیں تو فوراً موسیٰ کو اذیت پہنچانے والی قوم کی طرح پکار اٹھتے ہیں کہ یا اللہ تو خود ہی یہ کام کر۔ اور ان الفاظ کا مفہوم ہمارے لئے یہ وضع کیا گیا کہ اے اللہ آپؐ پر رحمت اور سلامتی فرما۔ یا آپؐ پر درود بھیج (درود کا لفظ قرآن یا عربی لغت میں نہیں)۔ ہم کبھی نہیں سوچتے کہ یہ مفہوم ذہن میں رکھنے سے قرآن پر ایمان ہی نہیں رہتا جس میں اللہ نے کہا ہے آپ ﷺ کو رحمۃ للعلمین بنا کر بھیجا گیا ہے۔ کیا ہمیں اس میں شک ہے (معاذ اللہ) کہ آپ ﷺ مکمل رحمت نہیں؟ اور ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں؟ یاللعجب۔ اللہ نے اس حکم سے ختم نبوت کے بعد فریضہ ''رسالت'' یعنی اپنے احکام لوگوں تک پہنچانا اور ان کے مطابق ایک نظام کے قیام و بقا کے لئے اسے امت محمد یہ کے سپرد کیا تھا۔ ہم نے اس پروگرام کو ثواب۔ گناہوں کی بخشش اور خواب میں حضور ﷺ کے دیدار کا اک نسخہ کیمیا بنا کر وردو وظائف تک محدود کر لیا۔

دوسری مثال تسمیہ کی ہے ہر جگہ اس کا ترجمہ شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے یا شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان بڑے کے' ملتا ہے۔ اور بچپن سے ہمارے ذہنوں میں اس طرح راسخ کر دیا جاتا ہے کہ کسی ایک بھی مسلم فرد کے ذہن میں مروجہ مذہب کو تیاگ کر دین اسلام کی طرف آنے کی آرزو تک پیدا نہیں ہو سکتی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حرف (ب) کا ترجمہ ساتھ کیا جاتا ہے یہ ٹھیک ہے لیکن قرآن میں یہ حرف' دیگر معانی کے علاوہ مقصد۔ غایت اور سبب ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اسم کا ترجمہ نام لکھا جاتا ہے۔ اسم کے معنی نام بھی ہے لیکن قرآن میں اسم تو اللہ کی صفات کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس ذات کا نام صرف اللہ ہے جس کے لغوی معنی صاحب اقتدار و اختیار کے ہیں' جسے عجمی سازش کے ذریعے محض پوجا پاٹ کے لئے فارسی زبان میں خدا کہہ کر پکارا جانے لگا۔ صفات اللہ بے شمار ہیں جیسے رحمٰن۔ رحیم۔ رب۔ خالق اور حاکم۔ تسمیہ میں شروع کرتا ہوں کے لئے نہ تو کوئی لفظ ہے نہ ہی حرف۔ اگر اس کا لفظی ترجمہ ''ساتھ صفت اللہ الرحمٰن الرحیم ہوتا تو اور بات ہوتی' مگر ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی ملی بھگت سے عیسائیت کے اتباع میں با محاورہ ترجمہ کر کے مسلمانوں کو اندھا کیا اور کہا اب اپنی قسمت کا ماتم کرتے ہوئے گاتے پھرو کہ تیری رحمت پہ میرے گناہوں کو ناز ہے۔ (رحمٰن کا ترجمہ بڑا مہربان Most Gracious رحیم کا بخشش کرنے والا یا نہایت رحم والا Most Merciful عیسائیت کا رنگ ہے) ہمیں سبق پڑھایا گیا کہ اس دنیا میں مصیبت۔ بیماری۔ بھوک۔ افلاس۔ زوال یہ سب اس کی رحمت ہے' اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں' جنت میں عیش اعلیٰ مقام ہوگا۔ اللہ کے نام کی مالا جپنے یا اس کی صفات کی تسبیح کرنے سے نہ ان صفات کے وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی اللہ خوش یا راضی ہو جاتا ہے بلکہ اللہ کی منشا اور رضا یہ ہے کہ ان صفات کے سوا جو اس کے لئے مختص ہیں باقی تمام صفات کی نمود (علیٰ

حد بشریت) انسانوں کے اندر اجاگر ہو جائے۔

قرآنک عربی زبان کی رو سے تسمیہ کا بامحاورہ ترجمہ یوں ہونا چاہئے کہ ''میرے کہنے یا کرنے کا مقصد' غایت یہ ہے کہ اللہ کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کی نمود انسانی معاشرہ میں عام ہو جائے''۔(یہی تھا ملخص اس چٹھی یا پیغام کا جو سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کے نام بھیجا تھا (۲۷/۳۰)۔اس ترجمہ کی رو سے بسم اللہ پڑھتے وقت جیسا کام ہوگا اللہ کی ویسی ہی صفت کے ذریعے اس کے قرآنی تصور کا ظہور ہوگا۔نوح علیہ السلام نے اپنے رفقاء سے فرمایا تھا کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ (پھر دیکھنا) بسم اللہ مجرھا و مرسھا (۱۱/۴۱)۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں قرآن کے تراجم سے مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا' صرف مفہوم سے اس کی تعلیم سمجھی اور سمجھائی جاتی ہے۔۔۔ایک پاکستانی مفکر قرآن نے بتایا کہ اپنے جذبات کی رو سے نہیں بلکہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی کے ذریعے یا تصریف آیات کی رو سے قرآن کریم میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مفہوم یہ ہے کہ خدائے رحمٰن و رحیم نے اس کتاب عظیم کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اس نے اشیائے کائنات اور نوع انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے وہ پوری ہو جائے (۶/۱۲) (۶/۵۴)۔ یہ نشوونما وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں (۵۸۔۵۷/۱۰) (۱۷/۸۲)۔۔۔۔چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں اس لئے خدا کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اس سے مقصد خدا کے اس پروگرام کی تکمیل ہو (۹۶/۱۶۳)۔

قرآن کہتا ہے کہ روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے لے نہ رکھی ہو۔کیا تسمیہ کے اس مفہوم کی رو سے قرآن پر ایمان رکھنے والی قوم کا فریضۂ اللہ کے عطا کردہ نظامِ ربوبیت (قرآنی حکومت) کا قیام نہیں؟ جس کے لئے اللہ نے اپنی صفت رحمٰن' رحیم اور رب سے قرآن کی ابتدا کی۔اور جس کے قیام و بقا کے لئے صلوٰۃ و زکوٰۃ کو فرض قرار دیا گیا۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکتوبِ کینیڈا

ایم۔ رفیق راجا، کینیڈا

نظریہ پاکستان اور قائداعظمؒ کے خلاف باتیں کیوں؟

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران
اے قائداعظمؒ ترا احسان ہے احسان

اپنوں کے دکھ۔ اس دنیا میں اپنوں سے بڑھ کر دکھ کوئی نہیں دیتا۔ دکھ ہمیشہ اپنوں سے ملتے ہیں بیگانے تو بیگانے ہوتے ہیں۔ غیروں کے دکھوں کو تو انسان بھلا دیتا ہے مگر اپنوں کے دیئے زخم کبھی نہیں بھولتے، بھولنا چاہیں تو بھی نہیں بھولتے۔ آج نئی نسل کے روشن خیال مگر ''ماضی فراموش'' نوجوانوں کا ایک طبقہ بعض اوقات یہ سوال کرتا ہے کہ ہمیں بھارت سے الگ ہونے کی ضرورت ہی کیا تھا؟ یہ گروہ بھارتی پراپیگنڈے کے زیر اثر تقسیم برصغیر کو ایک عارضی کاغذی لکیر جانتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ مطالبہ پاکستان کی جڑیں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پیوست ہیں۔ سماجی اور تہذیبی طور پر ہندو اور مسلمان ہمیشہ الگ الگ رہے۔ اس کا شدید احساس خود ہندوؤں نے مسلمانوں کو دلایا جو مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے قائل ہی نہ تھے لہٰذا سرے سے انہیں برابر کا شہری قرار ہی نہیں دیتے تھے۔ ہندوؤں کے تعصب اور تنگ نظری نے مسلمانوں کے ضمیر کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج کل جو پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ ہم علیحدہ کیوں ہوئے تھے ہم تو آپس میں بھائی بھائی ہیں یہ لوگ ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں۔ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ آج یہ سوال کہ پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا گیا شاید اس بنا پر ہے کہ جدوجہد آزادی میں شریک افراد نے نئی نسل کو اسلامی نصب العین سے آگاہ ہی نہیں کیا۔

1940ء میں قائداعظمؒ کے اس اعلان نے کہ دس کروڑ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ہندو قوم سے الگ اور جداگانہ قومی تشخص کے مالک ہیں، اپنا متمیز مذہب، معاشرہ اور نظریہ حیات رکھتے ہیں اور اس لئے اپنے اکثریتی آبادی کے علاقوں میں حق خود اختیاری کے مستحق و سزاوار ہیں نہ صرف دوقومی نظریے کو جنم دیا اور تحریک پاکستان کی بنا ڈالی بلکہ برصغیر میں انگریز ہندو کی تشکیل کردہ سیاست کا رخ پلٹ کر

رکھ دیا۔

انگریز ہندو منصوبے کے مطابق مسلمانان برصغیر کی قسمت میں اکھنڈ بھارت کے اندر ایک اقلیت با ایں ہمہ بہت بڑی اقلیت کا ذیلی' ثانوی و اتباعی مذہب مقدر و مختص کیا گیا تھا جو مختلف قسم کے تحفظات کا محتاج تھا۔ اقتدار اعلیٰ بہر حال ہندو اکثریت کی تحویل میں رہنا تھا اب صورت حال یہ تھی کہ دنیا میں کم ہی آزاد خود مختار اور مطلق العنان ممالک دس کروڑ آبادی پر مشتمل تھے لیکن یہ انگریزوں کی نافذ کردہ عددی جمہوریت کا کرشمہ تھا کہ انگریز اور ہندو برصغیر کی وسیع و عریض حدود میں مقید مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں اقلیت قرار دے کر فرزندان اسلام کی اتنی بڑی جمعیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو غلامی میں مدفون کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن عین اس بحران عظیم کے وقت قائداعظمؒ نے آواز بلند کی اور دس کروڑ مسلمانوں کے لئے اقلیت کا درجہ مسترد کر دیا اور انہیں قوم کے مرتبے پر ایستادہ کیا تا کہ وہ اپنے حق خود اختیاری کا مطالبہ کر سکیں اور وہ آواز نہ صرف برصغیر میں گونجی بلکہ دنیا کے ایوانوں میں بھی شنوائی سے سرفراز ہوئی ور دیکھتے ہی دیکھتے مختصر عرصے میں مسلمانوں نے برصغیر کا سینہ چاک کر کے پاکستان بنا لیا جو آزاد' خود مختار ملکوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیسے اتنے تھوڑے عرصے میں ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ملک کو بنانے والی ہستی ایسی تھی جو کہ بکاؤ مال نہیں تھی۔ ورنہ اس دور میں انگریزوں اور ہندوؤں نے بڑے بڑے مذہبی پیشوا اور سیاست دان خرید لئے تھے۔ اگر اس وقت باگ ڈور کسی اور شخص کے ہاتھ میں ہوتی تو ابھی تک پاکستان نہ بن سکتا۔ خاص کر اگر کسی مذہبی پیشوا کے ہاتھ میں ہوتی تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ پاکستان بن جاتا۔ کیونکہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جتنا ملک اور قوم کو نقصان پہنچایا گیا ہے وہ مذہبی پیشوا ہی ہیں اور سیاست دانوں کے کیا کہنے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی سیاسی لیڈر یا مذہبی لیڈر انڈیا میں جاتے ہیں تو پاکستان اور بانی پاکستان کے خلاف بیان بازی شروع کر دیتے ہیں' اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے۔ یہ حکومت کا فرض ہے کہ پاکستان میں یا پاکستان سے باہر جو بھی سیاسی یا مذہبی لیڈر پاکستان یا بانی پاکستان کے خلاف بکواس کرے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ جن کو زیادہ تکلیف ہے وہ ملک چھوڑ کر وہاں ہی چلے جائیں۔ کیونکہ ہندو صرف ہندو اور مسلمان صرف مسلمان ہے۔ ان دونوں کا ملاپ آگ اور پانی کا ملاپ ہے پاکستان کے ابدی دشمنوں ہندوؤں کے دیس میں جا کر دوٹوک اور صاف الفاظ میں کہا جا رہا ہے کہ پاکستان کا دوقومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آنا ہی غلط تھا۔ بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کی شان میں بھی گستاخیاں کی جا رہی ہیں۔ پاکستان ہی میں رہ کر اور پاکستان ہی کا کھا کر بانیان پاکستان اور پاکستان کی شان میں گستاخیاں کر رہے ہیں اور پوری قوم خاموش ہے۔

ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ کیا کسی بھارتی سیاستدان نے نہرو یا گاندھی کے خلاف کبھی بات کی ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جو پاکستان ہی کا کھاتے ہیں اور پاکستان ہی کے خلاف باتیں بھی کرتے ہیں۔ وطنِ عزیز کے خلاف ہر سازش کا منہ توڑ جواب دیں اور پاکستان کے غداروں سے مقابلہ کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مہک مفتی، سویڈن

Voice of Youth

سٹاک ہوم کانفرنس

ہر سال ایسٹر کی چھٹیوں میں نوجوان مسلمانوں کے لئے سٹاک ہوم مین ایک اسلامی کانفرنس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سال کی کانفرنس کے متعلق کچھ احوال میں اپنے مسلمان بہن بھائیوں کو بتانا چاہتی ہوں۔ یہ کانفرنس ان نوجوان مسلمان بہن اور بھائیوں کے لئے رکھی جاتی ہے جو کہ 27-15 سال کی عمر کے درمیان ہوں۔ یہ کانفرنس پچھلے 11 سال سے ہو رہی ہے اور مجھے اس سال دوسری بار اس میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ یہ کانفرنس پورے سیکنڈے نیویا کی سب سے بڑی اسلامی نوجوانوں کی کانفرنس ہے جس میں نا صرف پورے سویڈن کے مختلف شہروں سے بلکہ ناروے سے بھی ہمارے مسلمان بہن بھائی شرکت کرنے کے لئے آتے ہیں۔

اس کانفرنس میں ہر سال کی طرح ایک مخصوص موضوع رکھا گیا اور پھر دنیا کے مختلف ممالک سے سکالرز اور علماء بلائے گئے۔ جنہوں نے اس سال کے موضوع ''اخلاق' علم اور ایمان'' کے بارے میں گفتگو کی۔ یہ سکالرز و علماء مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سب نے ان 3 دنوں کی کانفرنس میں مختلف باتوں پر روشنی ڈالی۔

علم کے حوالے سے ایک سکالر محمد الگوماتی نے جو کہ طبیعیات کے پروفیسر ہیں انہوں نے ہمیں سائنسی تحقیقات میں مسلمانوں کی شراکت کے متعلق ایک لیکچر دیا۔ پروفیسر الگوماتی نے بتایا کہ سائنس میں مسلمانوں کی تحقیقات کو اکثر و بیشتر عام دنیا کی نظروں سے دور رکھا جاتا ہے۔ خصوصاً مغربی دنیا کی سائنسی کتابوں میں مسلمانوں کی تحقیقات کا ذکر تک نہیں ملتا۔ مسلمانوں کی شراکت کے ساتھ ساتھ ان کی ایجادات پر بھی خاموشی پائی جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ ہماری آج کی دنیا کن بنیادوں پر کھڑی ہوئی ہے؟ اور وہ 1000 سال کا عرصہ جس کو یورپ میں The Dark Age کہا جاتا ہے' جس دوران اسلام کے عروج کا وقت تھا کیا اس دوران کوئی سائنسی ترقی نہیں ہوئی؟

اسی طرح کئی دوسرے سکالرز نے اخلاق کے متعلق بھی بات کی جس میں سب سے زیادہ ہمارے پیارے نبیﷺ کے اخلاق کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ وہ کیسے انسان تھے' ان کا دوسروں کے ساتھ کیا رویہ تھا اور ان کے اخلاق کو دیکھتے ہوئے ہم مسلمانوں کو کیا سیکھنا چاہئے۔

کانفرنس میں کچھ خواتین سکالرز نے بھی اس موضوع پر بات کی جس میں مسلمان عورتوں کے اخلاق کا بھی ذکر ہوا۔ ہمیں اسلامی تاریخ میں کچھ مسلمان عورتوں کی خدمات کے متعلق بھی بتایا گیا جو کہ میری نظر میں ایک ایسا اہم موضوع ہے جس کے متعلق نہ صرف مغربی بلکہ مشرقی معاشرے میں بھی بات نہیں کی جاتی۔ ’ثنا فوضی‘ نام کی ایک عالم خاتون‘ جو ڈاکٹر بھی ہیں‘ اس بات پر زور دیا کہ آج یورپ میں رہنے والی مسلمان لڑکیوں کے لئے مثالی مسلمان عورتوں (Role Models) کی بہت ضرورت ہے جو کہ پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ دین پر بھی یقین رکھتی ہوں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ ہمارے سامنے کچھ ایسی جوان مسلمان عورتوں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں۔ ایک عالم شیخ محمد مسلم نے ہمیں اپنے لیکچر میں بتایا کہ ایک مسلمان کا اخلاق کیسا ہونا چاہئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک مومن کو ہر کام سے پہلے ایک اچھی نیت رکھنی بہت ضروری ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ایک انسان صرف نماز اور روزوں ہی کے دوران مسلمان نہیں ہوتا بلکہ اس کو ہر وقت اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہونا چاہئے۔

ایمان ایک ایسا موضوع تھا جس کے متعلق ہر لیکچر میں بات ہوئی اور کانفرنس کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ایک مومن میں یہ تینوں صفات یعنی اخلاق‘ علم اور ایمان ہونی بہت ضروری ہیں اور ان کو پانے اور بہتر کرنے کے لئے ہر مومن کو جہادِ نفس کرنا ہوگا۔

کانفرنس کے دوران علماء اور سکالرز کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوان مسلمان بہن بھائیوں کو بھی موقع دیا گیا کہ وہ اسٹیج پر آ کر اپنا موقف اور رائے پیش کریں۔

اس کانفرنس میں ہمارے مسلمان بھائیوں کے لئے فٹ بال کا مقابلہ بھی رکھا گیا جس میں ہر ٹیم اپنے اپنے شہر کی طرف سے کھیلی اور جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی اور دیگر انعامات سے نوازا گیا۔

کانفرنس میں امریکہ سے ایک پاکستانی میوزیکل گروپ 786 نے بھی شرکت کی۔ یہ 4 پاکستانی نژاد امریکی لڑکے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور موسیقی سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی موسیقی سے جو کہ مشرقی اور مغربی موسیقی کا ملاپ ہے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان لڑکوں کا کہنا ہے کہ وہ مغرب میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ایسی موسیقی دینا چاہتے ہیں جو کہ ماڈرن موسیقی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام بھی رکھتی ہو۔ اس گروپ نے ہمارے سامنے اپنے کچھ خوبصورت گیت پیش کئے۔

یہ کانفرنس بہت کچھ سیکھنے کے ساتھ ساتھ نوجوان مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا ایک بہت اچھا موقع ہوتا ہے۔ جہاں سب اکٹھے نماز ادا کرتے ہیں اور کھانے کے وقت ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہیں۔

ان تین دنوں میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں ایک ایسی جگہ پہ ہوں جہاں دنیا کے ہر کونے سے تعلق رکھنے والے مسلمان اکٹھے ایک ہی مقصد کے لئے یہاں موجود ہیں اور وہ یہ کہ دین کے بارے میں مزید سیکھنا اور اپنے ایمان کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی جگہ معلوم ہوتی تھی

جہاں سارے مسلمان بہن بھائی امن اور سلامتی اور پیار محبت سے اکٹھے رہتے ہوں۔ جہاں چاہے کسی کا رنگ گورا ہو یا کالا' چاہے کسی نے داڑھی رکھی ہو یا نہیں یا پھر کسی نے حجاب لیا ہو یا نہیں اس کانفرنس کے دروازے ہر مسلمان کے لئے کھلے تھے۔ یہ ایک ایسا ماحول تھا جو کہ ہم ہر اسلامی ملک میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں جہاں رنگ' نسل' امیری یا غریبی کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ کانفرنس میں نماز کے وقت میرے ذہن میں علامہ اقبال کا ایک شعر آیا۔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

مجھے اپنے مسلمان بہن بھائیوں میں یہ اتحاد اور محبت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور اب ایک امت کے خیال کا حقیقت میں بدل جانا بالکل ناممکن نہیں لگتا۔

اس کانفرنس کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے افریقی نژاد امریکی عالم شیخ المین عبداللطیف کے لیکچر میں بتائی ہوئی بات درست لگی کہ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں جن لوگوں نے پہلے اسلام قبول کیا اور اس کو پھیلایا وہ اس دور کے جوان مرد اور عورتیں تھیں۔ اسلامی دور کے شروع میں جو کام ہوا اس میں سب سے زیادہ نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور اس کو آگے بڑھانے اور پھیلانے میں سب سے زیادہ کام کیا۔

میں اپنے اس مضمون کو شیخ المین عبداللطیف کی اس بات سے ختم کرنا چاہوں گی کہ ''جب اسلام دوبارہ روشن وقت دیکھے گا اور دوبارہ دنیا پر نافذ ہوگا تو نوجوانوں ہی کے ذریعے ہوگا۔'' اس کانفرنس میں شرکت کے بعد میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ہمارا نوجوان طبقہ اسلام کے لئے کام کرنے کا اور آگے بڑھنے کا شوق اور جذبہ رکھتا ہے۔ ان کے کام' جوش اور خیالات کو دیکھ کر میں یہ یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر آج مسلمان دنیا پر مصائب ہیں تو یہ نوجوان طبقہ ہی انشاء اللہ اسلام کو ایک روشن مستقبل دینے میں کامیاب ہوگا۔

(مسلمانوں کی سائنس میں ایجادات اور تحقیقات کے متعلق جاننے کے لئے مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر جائیں۔

(www.muslimheritage.com)

INTERCESSION:
What Is The Right Concept?

By
Bashir Abid

==================

INTERCESSION - dictionary meanings are: i) Mediation ii) Prayer or petition in favour of another. INTERCEDE: To act between parties with a view to reconciling differences. Arabic tri-literal root of this word is: (sheen - fa - ain) - shafa'a; to double something; to attach, add something with another; pairing of things; either part of a pair; even numbers (opposite of this is watter). Raghib Asphahani in Mufredaat wrote: Al shafa'at is to accompany someone with a view to take care and help him. In Islamic Jurisprudence Shuffa'h means: A special right of purchasing a property whereby a person can own it at market price. Ain al shaafeh - eyes which due to weakness or disease see the things double (double vision). Naaqah al shaafeh - a she camel with two babies; one accompanying her and the other in the womb (yet to born). Naaqah al shafooh - a she camel who let the entire milk in one milking instead of twice a day. Al shafa'ai - different kinds of grasses which grow together in pairs (Taj ul A'roos). Al shaa't al shaafeh - a goat accompanied along with her baby (Ibn Faris).

It becomes clear from these definitions and examples that basic meaning of INTERCESSION (Shafa'at) is to act jointly and to look after each others interests. Nepotism or undeserved favoritism (Sifaarish or Wasta or Waseela) is its corrupted meanings which has been adopted and spread by characterless persons.

The main goal of Quran is to establish a socio-economic system which satisfy man's needs and develop his human potentials. For this purpose, Quran advocates a system of collective living rather than individualism because the development of human potential, the character building, and the satisfaction of man's needs could be achieved only in an healthy and stable society. A social system which promotes or encourages selfishness, greed and exploitation of fellow human beings; and where the individual interests prevails over the collective interests; and where the haves do not care for the haves not; in that system, in spite, of all progress, developments and abundances, the human potentials remain suppressed and the human needs remain unsatisfied. Such a social system produce corrupt and character less individuals and creates severe imbalances in all spheres of the society.

Accordingly, in a Muslim society (that follows the Quranic Values System) every individual is an INTERCESSOR - (shafeeh), in the sense that they look after each other's affairs and protect each other's interests. They show friendly regards, make every effort on each other's behalf to achieve the objectives and are kind among themselves graciously. Similarly, The Chief Executive of an Islamic State (The Ruler) is INTERCESSOR of his fellow-citizen. His primary responsibility is to ensure protection for every citizen and not to let any of his subjects to feel lonesome and neglected in respect of his individual rights and basic needs.

This sort of INTERCESSION among the Muslims is not limited to themselves but extends to other nations also because their commitment with God is to make His System of Economy (Rububiut al a'limeeni) successful and useful for the whole of humankind. For this purpose they are enjoined to cooperate with other nations in all works which are carried out according to divine laws for the welfare, peace, stability and strength of mankind (Bir wal Taqwa). On the contrary, they are prohibited not to cooperate with those who acts against the interests of humankind and make plans which create division, rifts and disunity among the people and sap their energies and vigor and leave them unsubstantial (Ithm wal A'dwan). Accordingly, Quran says: "Mann Yashf'a Shafa'atan Hassanatan.... Whoever help and support a good cause, he shares in all its credit and in its eventual victory - Wa Mann Yashf'a Shafa'atan Sayie'atan... And whoever supports a bad cause he shares in its evil consequences... (4:85).

This is Quranic concept of INTERCESSION. Now, compare this with the traditional concept. It is believed that on the Day of Judgement, after hearing and looking into everybodys' record, God will sentence the criminals and the sinners to hell. Then, the pious and the holy men, particularly the prophets (and from among them Prophet Mohammed in particular) would come forward for the defence of these criminals and request general amnesty. God will pardon them on the request of these holy and pious men and send these criminals from hell to heaven. They call it INTERCESSION.

Obviously, this concept of INTERCESSION is not meant in the Quran rather it demolishes the whole edifice of Islam which is firmly established on the principle of accountability. Quran says: "Fa Mann Ya'mal Misqala Zarratin KhairanYara ho. Wa Mann Ya'mal Misqala Zarratin Sharran Yara ho... (meaning) On the day of judgment everyone will be shown the exact import of everything that they had thought, said or done in this life of probation, however they may have concealed or misinterpreted it in this life. Everything will be considered in taking the account and the account will convince the

persons concerned themselves. It will be done openly and convincingly: they "shall see it". (99:7-8).

It seems that this concept of INTERCESSION (patronage of the criminals) is originated during the era of despot kings when the Quranic Values System was put aside and the principles of fairness, justice and accountability were ignored. Influential men in the royal courts used to intercede to protect the criminals. Quran calls it - (Shafa'atan Syie'stan) - supporting a bad cause or an evil person. Moreover, this concept might have got strength from the concept of Atonement (Kuffara) in Christianity. According to this concept Lord Jesus (as) would intercede for all sinners among his believers on the Day of Judgement. It was a strong argument with Christians to show their superiority over the Muslims. Therefore, it might have inspired the Muslims to contrive similar beliefs about Nabi Mohammed (pbuh). They concocted such stories (Hadith) that on the Day of Judgement when God shall sentence the sinners to Hell Nabi Mohammed (pbuh) will fall down in prostration before God and will not raise head until He forgives all the sinners and send them to heaven. These falsehoods might have given some sort of superiority to Muslims over the Christians but at the same time these proved very fatal to Islam which is firmly founded on the principles of accountability. All The Ahadith regarding INTERCESSION attributed to the Nabi (pbuh) are false and, in fact, did great harm to Muslims' morality. Quran does not advocate such INTERCESSION. It states explicitly: "On the Day of Judgement none shall avail another, nor shall INTERCESSION be accepted, nor shall COMPENSATION be taken, nor shall be anyone helped" (2:48). In other words, Quran strictly warns: Be on your guard; do not think that special favours exempt you from the personal responsibility of each soul.

In order to prove their standpoint, the believers in INTERCESSION also quote some verses from Quran. For example, in verse 2:255 it is stated: "....who is there can intercede in His presence except as He permits...."They conclude that God in His Wisdom and Plan may grade His creatures and give one superiority over another. Then by His Will and permission such a one may intercede or help. Nabi Mohammed would intercede for the Muslims by the will and permission of God.

This conclusion is absolutely wrong.

In the same verse, it is stated: "....His are all things in the heavens and on earth...." -(2:255), How can then any creature stand before Him as of right, and claim to intercede for a fellow-creature? In the first place, both are His, and He cares as much for one as for the other. In the second place both are dependent on His Will and Command which He never changes (eternal and

immutable). God’s knowledge is absolute, and is not conditioned by Time or Space. Moreover, this conclusion is basically against the principle of fairness, justice and accountability which is continuously repeated throughout the Quran. If we believe in INTERCESSION as much as we believe in ACCOUNTABILITY then it will be a manifest contradiction which mislead the reader to think of Quran (ma'az Allah) as a book of contradictory beliefs. For example, in the preceding verse (quoted above) Quran says: "O ye who believe! spend out the bounties We have provided for you, before the Day comes when no bargaining will avail, nor friendship, nor INTERCESSION...." - (2:254). And, then in the subsequent verse it says: "....Who is there who can intercede in His presence except as He permits..." - (2:255). If we take this meaning of the verse that one can intercede with the permission of God and his intercession will be accepted then these verses clearly contradict each other.

The question arises, then what is the correct meaning of this and the other similar verses? Actually, our thoughts and actions produce results simultaneously but often we cannot see or perceive them until these get matured and become visible. There is a well measured period for the maturity of each act to produce visible results. For some of our acts, this period is so short that we can see the results in our life time but for the others, it is so long that in order to see the results we have to wait till the Final Day. In order to understand it in a better way, we can classify the phenomena of human activities into concrete realities and abstract realities. Former, we face in our life span and the latter, we will face in the hereafter. In other words, there is a built-in system of reward and punishment in the Divine Laws. God does not need help or advocacy of anyone whosoever.

Quran has explained the process of reward and punishment figuratively so that human mind can grasp it easily. Regarding the Day of Judgement, it presents somewhat similar scenario as we often see in our judicial courts. For example, we see the criminals are being brought to the court and then follows the proceedings. The judges, the lawyers, the witnesses, and the police, all are present there and listen to the hearing and judgements. Similarly, Quran says: "And behold! ye come to us bare and alone........We see not with you, your intercessors....(6:95) ; " And there will come forth every person: with each will be a person (just like a policeman) to drive and a person to bear witness" -(50:21). These persons, who will bear witness, will not come along with the person by themselves but will be called and given permission to bear witness. In fact, they (the witnesses) are called INTERCESSORS and they are the one who are mentioned in verse 2:255 and other similar verses: "mann zalazee yashfa'a ho illah beh izneh - who can stand with the others against His will or without His permission".

These INTERCESSORS, among others, will also include Messengers about whom Quran says: "One day will God gather the Messengers together, and will ask: 'what was the response you received (from men to your teachings)?."....(5:112). Similarly, Angels (malaika) will also be asked: "The day that the Spirit and the Angel (malaika) will stand forth in ranks, none shall speak except any who is permitted by God and he will say what is right." - (78:38). In these verses, therefore, the Witness (Shahid) means the Intercessor (Shafeeh). Because, to bear witness in one favour is a great help to him. This meaning is also supported in verse 43:86: "And those whom they invoke besides God have no power of INTERCESSION. - only he who bears witness (Shahid) to the truth, and they know him. "In other words, INTERCESSION means to bear true Witness.

Traditional meaning of INTERCESSION are misleading. Quran did not use the word ' INTERCESSOR ' - (Shafeeh) - for Nabi Mohammed (pbuh). It uses the word 'WITNESS' - (Shahid) for him (16:89). Quran repeatedly warns those who believe in INTERCESSION. It states: "Then will no Intercession of (any) Intercessors profit them."-(74:48). And again,....." No intimate friend nor Intercessor will the wrong doers have, who could be listened to." - (40:18). And again, "...Every person draws the meed of his acts on none but himself, and no bearer of burdens can bear the burden of another.... (6:164). Heaven is not for those who look for Intercessors to help them enter it. Heaven is for those who earn it by their righteous deeds. This fact is stated in the Quran in these words, " ….Behold! this is your Heaven! You have been made its inheritors for your deeds."- (7:43).

Such beliefs (traditional) in INTERCESSION are held by those nations who have lost the will and energy to work hard. They have become idle and inert and look for easy means and short cuts to success. Could you imagine, how easy it is to get Paradise through INTERCESSION? You are simply required to profess in the Nubawwat of Mohammed (pbuh) or Jesus (as) - if you are a Christian! or Moses (as) - if you are a Jew! or to revere any holy and pious man - if you are a Mushrik! Quran states that when the Jews suffered downfall and lost their noble values, they started to believe in similar INTERCESSION as we find among the Muslims today. They believed: "The Fire shall not touch us but for a few numbered days.... (2:80). In reply, Quran said: "Ask them; Have you taken a promise from God? and then answered itself that tell them this is a wrong belief. God's Law, in this regard is: "Those who do wrongs they shall go to hell and those who do righteousness they shall go to heaven" - (2:82-83). It is an immutable moral law with no exception.

It becomes quite clear from the above discussion: i) In this world, INTERCESSION is to stand with someone in order to help, advocate, and support him. If this support is for good cause, the intercessor will get good

reward and if it is for a bad cause he too, will share a part of the punishment along with the criminal. ii) In the hereafter, the concept of intercession is stated figuratively. It is like witnesses which are often called upon in judicial courts. In reality, God does not need advocacy of anyone whosoever. iii) To intercede for criminals or to favour someone undeservedly is against the teachings of Quran. Therefore, this sort of belief in INTERCESSION is not right. We should not rely upon any power or person other than God to help us or intercede for us. No one has more power and intelligence than God.

Quran says: "What! Do they take intercessors others besides God? Say: "Even if they have no power whatever and no intelligence?" - (39:43). Say: "To God belongs exclusively all sort of INTERCESSION".... (39:44). He Grants this right to those who follow Him in Quran.

God Says: "One Day We shall raise from all people a Witness (Shahid): Then, there will be no permission for unbelievers nor they will receive any favour."-(16:84).

Wa Ma Aa'laina Illalbalagh

NB: Most humbly, I dedicate this article to my honorable teacher (late) Allama Ghulam Ahmed Parwez - (1903-1985). In fact, this article is based on his interpretation of Intercession in his highly acclaimed and scholarly work: LUGHAT-UL-QURAN. (in Urdu language).

****

LAW OF THE JUNGLE (Part III)

By
Aboo Bakr Rana

==================

In a nutshell the former arguments were, when Satan is surrounded by the forces of nature to surrender, he says to God Almighty, “My Lord, who am I to disobey!” (Quran: chapter 15, verse 39). In other words, he is condescendingly taking the responsibility of the mistake, when he admits in the Quran, that he has committed a mistake in disobeying the command of God, when it was mandatory for him to prostrate before Adam. At the same time, Satan does not want to take the responsibility of the mistake upon himself. In order to prove that he is correct in his reasoning, and when he has no further reasons left to advance in his case, he finally asks permission from God, for more-time, so that he can prove to God that it is He, who is hiding His true intentions. *Satan has doubts about the intentions of God.* Instead of having the courage to accept his defeat, he wants to prove to God that he, indeed, has the power to destroy the world of these Human creatures. In the process of time, Satan’s intentions are, this universe ultimately, will not be man-made in accordance with God’s scientific laws, rather he wants it to be Satan made, in spite of the fact, Satan has begged for more time, from God, to regain his lost worth. His demand from God Almighty appears to be meaning,

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

(Satan begs from God, “At least, till the Last Moment, let me feast myself in this awesome universe that Thou hast created!)

Satan has also threatened, *“Just watch now, what I do to Your new creation”* (Chapter Al-Hijr: verse 39). Apart from the damage and sufferings that humankind has to endure, these words of Satan are, in fact, a threat to God. The purpose of Humankind on earth is not to finish Satan, but to make him prostrate; as God had created Adam above the status of Satan. When we think carefully, by threatening to destroy the plan of God, Satan is in fact, challenging God. The discrepancy in our understanding of this issue is, we human beings, are underestimating the nefarious designs of Satan. That is why all our good deeds end in frustration, and all human efforts are proving futile, as far as our characters and sacrifices are concerned. *By distorting the essential meanings of the words of God Almighty, that are in the Quran,*

Satanic minds are changing our lives. Instead of understanding the worth and value of God's programme, we waste our lives in the service of Satanic forces, by misunderstanding and misinterpretating God's words. Behind the façade of Islam, Satan is working his way and exploiting mankind, by changing the meanings of Divine words. For example in the Quran, the word *Haram* means, forbidden, restricted or prohibited. But we are being told that *Baytil harami* or *Baytul-muharam*i, the second name of Ka'aba, means the sacred house. But outside of Arabia, the city of Jerusalem, is being called *Baytul-Muqaddus,* which in fact does mean, the sacred house. None of us bothers to know, why the difference in these titles? The *Ka'aba*, which is meant to ultimately become the centre of all humankind, must not be restricted or prohibited. So why is it being called *Baytul Muharrami?*

Space prohibits me here; otherwise I can quote several vital terms of the Quran, whose meanings, just to suit our interests, have been completely changed. Quran was revealed for the benefit of uniting Humankind as one family and to finish human exploitation. Every Muslim is striving day in and day out to abide by the words of God because he fears the wrath of God. And yet, Muslims are, we must admit, daggers drawn against each other. Every Muslim nation, culture and in every Muslim family, we are exploiting each other, mentally, morally, materially or time wise, in the cloak and dagger games that we play. Unless we don't accept this situation we will never progress. The main cause, why Muslims of today are being chased is, because we only pay lip service to Islam. The very *Islamic laws,* that once changed an illiterate group of Arabs and built an Islamic empire, in the words of a western writer, from 'Cordoba to Multan,' the meanings of the same laws of Islam have now been changed, by our adversaries, to suit their own interests. Our adversaries are much more well versed about Islam, than the Muslims who preach in the public gatherings and print religious material. That is why Muslims are letting themselves being used all over the world.

We, the so-called Muslims do not care about humanity at all, we will engage in all kinds of researches in various fields of science, hardly are we serious, when it comes to matters concerning this creation, called Man, for which this whole universe has been made. That was why, one true Mujahid in the making years of Pakistan had said,

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

These words electrified and resonated like thunder in the hearts of each and every member, of the then one and only Muslim League. Please ask any old person, if there is any left, who belonged to the original Muslim

League. He may be able to narrate and tell you, better than me, under what circumstances and how did Pakistan happen to emerge on the map of this world. Yes, we believe, there was one honest heart that was leading the Muslim League, but we must also believe, there were other honest Muslims also who followed and believed honestly in their honest leader. In the present times, the common individual does not know who to trust. When “honesty is the best policy” is converted into “honesty is the best principle,” gentle hearts, then evil forces have to surrender. As nobody was exploiting, hence nobody felt exploited. Every Muslim cared for each other. Their hearts were beating in unison, every day and every moment in those days. Now we are being told that times have changed. As if the elephants have started laying eggs. Times have not changed, it is our intentions and motives that have changed. The materialistic concept of life is our heartbeat now instead of the Islamic ideology, which was the heartbeat of the founders of Pakistan. In the words of Parwez[R] ,

“It is because of the materialistic concept of life that lawlessness is on the rise in the advanced nations of the world. To control the increasing crimes, their administrators have no other option left but to recruit more policemen. Consequently, a marathon has started between increasing crimes and increasing the number of policemen. It is not practically possible to appoint one policeman on top of every citizen; therefore the control of crime rate has become preposterous. Under these circumstances, however we think, every political government or party will think of policies for its own survival. This is the natural end product of the materialistic concept of life that is the foundation stone of the western culture.” (Tolu-e-Islam, January 1983)

The question that haunts every thinking mind is, how can anyone grow up normally in an abnormal system? This is the question which comes to my mind, every time I begin to read the words of the Quran. Natural growth can only take shape in a natural system. Gentle hearts, to have a natural culture there are natural laws given to humankind in the Quran. If only our administrators care to think carefully on its words. The Quran clearly tells the condition of hypocrites, in Chapter 2, verse10:

فــــی قـــلــوبهـــم مـــرض

(They do not have clear intentions, because of which their *“hearts are diseased”*)

And the hearts become diseased when the thoughts are ambiguous and confused. In the same verse, the Quran further explains to us, why they do not have clear intentions. They cannot decide because they suffer from

Nafus (identity) crisis in themselves. In psychological terms it is known as a split personality. And yet, in other chapters of Quran, we are further told of the three basic kinds of *Naf'oos* (identities) in every person. One is called *Nafus e Ammaa'ra*, the second is called *Nafus e Lu'aama* and the third is *Nafus e Mut'ma'ina*. It is the conflict of these three basic identities that keeps the person in torture and we become victims of split personalities. This is the root cause why the *hearts are diseased*. In order to purify our hearts, Islam gives us a system of laws, that gives the message of *Toheed* (Unity) in the Qur'an. It is only by implementing the laws of the Quran, we create an Islamic environment that guarantees peace within ourselves to safeguard the growth of the 'self' that is within each of us.

Nowadays almost everyone, takes these frustrations and mental conflicts as just another fact of life and sleep over them. Consequently, we are transforming our world into a jungle of grown up children. Anyone, who speaks against the exploitation in the system, is considered an odd one and a stranger, and is made the target of ridicule. That individual is gagged, tortured and humiliated, by the majority, until we hear no more of that voice. But why should anyone bother? Preachers of all religions tell us a very simple answer, "Don't think! Just leave it to God!"

All books that are being written, all literature in the form of periodicals, newspapers, magazines, and in the overwhelming majority of cold print, the theme is about 'power' in one way or the other. Even in the religious literature and propaganda, they hardly talk of God's disciplines that will bring peace and harmony among us. It is about God's kingdom and rule. The words of kingdom, rule, power, luxury, strength and their synonyms actually incite passions, towards dominating each other, instead of encouraging compassion, harmony and reason in the general public. Though kingdom it is that God promises, but that kingdom means peace and discipline among the Muslims. Not roaring and shouting at each other, for God's sake. Kingdom is not the ultimate charm that one ought to seek from this life on earth. It is the beauty of balance, peace and harmony, which Quran teaches, and that ought to be the focus of our thoughts.

Muhammad[PBUH] was not searching for power in the cave of Hira, it was his quest for **"The Truth."** The profundity and depth of Messengers' thoughts were focused in searching for the root causes that were degrading human worth. What the Messenger observed in his environment was that human dignity was being butchered by human beings themselves. The honour of the Arabs was not in their deeds; it was rather in their material wealth. Life was negating life. Life was dominating life. Life was ruling life. Life was deceiving life. Life was humiliating life. Life was using life. In the Arab culture, women

were being used, children were being buried alive. Every person was either using the other or was being used by the other. Life was exploiting life. This could not be justice, something was wrong somewhere. These seem to be the thoughts of the Messenger. As he quietly watched all this, he kept wondering, why?

Someday in the future, when we will accomplish the precise definition of 'growth of life,' it shall then be distinguished, whether we are using each other or are we naturally helping each other in our daily activities. If we can substitute, in actuality, the term "power" with that of "balance," explicitly or implicitly, we may possibly achieve our goal towards a peaceful world. For example, while reading a penetrating study of Islam, it would be relevant here to share with you a small paragraph of the book. The author writes:

"If one truth of earthly Islam is that its programme worked for a time well, another is that it was only for a time. As others of man's civilizations have done across the centuries, the Arab civilization rose, flourished for a period – and then declined. The fall of Baghdad in 1258 marks the formal end of the once tremendously successful Arab empire. The Mongol invasions that that fall epitomizes certainly dealt the Arab a devastating blow. Many millions were killed; whole areas were laid utterly waste; and political rule in the centre of the Muslim world passed into the hands of barbarian infidels. Yet the date is but a symbol…………..." (Islam in Modern History, page 40).

The whole paragraph actually reeks of "power" and stinks with dead bodies and wastelands. Yet nowhere, has the author used the word "power." It is not only him, one reason that I refrained from using his name; it is all of us gentlemen, who are guilty, in this human jungle. Satanic forces are spinning all of us on a stampede. Or just like the floods, which do not ask if you are an innocent tourist or a local inhabitant of that area. Why the house of the virtuous is not spared by the flood waters? These are the kind of real questions, which we ought to be investigating. Why God lets it happen in such a manner, when He has promised that our good deeds shall be rewarded? It only means those deeds that we deem good, in reality do not come up to the standards of universal goodness. We judge good deeds by our own standards, without giving a thought whether those standards have any rational base or not. In our present times, everything is relative. Those of us, who ardently desire to live our lives in peace and tranquility, will have to explore and investigate the root causes of our misfortunes and misgivings. Or else be prepared to face the consequences and remain in suffering. The freedom to choose our ways in life is ours. Like every train needs tracks to run safely, our brain needs those tracks of laws to grow and flourish in this world in a peaceful manner. Gentlemen, as Muslims, we don't need to be

flattered, in our times of crises, or reminded of our glorious past. What is urgently needed in our situation, are sound minds which can think in a balanced way. The same author further writes,

"In addition to quickly attaining political and economical mastery, Muslim society carried forward into new accomplishments both art and science. Its armies won battles, its decrees were obeyed, its letters of credit were honoured, its architecture was magnificent, its poetry charming, its scholarship imposing, its mathematics bold, its technology effective."

"The achievement of Muslims was that they welded these into a homogeneous way of life……...The centre of this unifying force was Islamic law……The law gave unity to Islamic society, from Cordoba to Multan."

In the same book, while analyzing the situation of Pakistan's birth, he further writes, *"Delays in deciding issues at the Islamic level, obstacles thrust up by religious implications, claims put forward in the interests of Islam – all these could not stop the inexorable march of this massive reality. They could not even hide it; they seemed rather to render it starker……..The imperious need to make Pakistan survive overshadowed at first all question of giving it this or that form, of selecting shape for its destiny. This need for survival continued to be important, if not actually dominant. As the first wild months were mastered and the new dominion rose to its feet, from the bludgeonings of its inauspicious inauguration, it began slowly to cast about for guidance and to consider where it wished to go…..Yet one may imagine that it will be some while yet before our relentless modern world allows such a nation the luxury of choosing, or even of thinking to choose, its course very freely. (Ibid., page 220-221)*

The acumen, insight and scholarship of this professor, is indeed admirable, on Islam. If Islamic Law, which he has confirmed, has the ingenious to unite human beings, in a homogenous way of life, from 'Cordoba to Multan' then what is holding him from becoming a Muslim. Perhaps the respected professor does not want to live a homogeneous way of life. Or it appears, all that he could find in today's Islam were contradictory interpretations, devoid of any sensible Islamic Law. He is, therefore, more inclined towards the life of power. One element is very clear of which he is certainly correct and aware; the force behind the unity of Muslims was the *'Islamic Law.'* Instead of writing, *'the centre of this unifying force was Islamic Law,'* he could also have written:

"the balance in the unity was the Islamic Law."

But force and power attracts all of us these days. Gentlemen, as I mentioned before, we do not seem attracted in our lives towards harmony

and beauty in balance. What attracts, excites and motivates our dumb brains is, "Power." Power it is that makes one superior, which is what Satan claimed itself to be; when he wanted to be superior to Adam. If we can somehow extract, for our future generations, the beauty of law and order in our lives instead of power, I am confident that it will bring more peace and harmony in their lives, the peace for which we are lisping and endeavouring in vain. Lack of peace is making us desperate to get out of this jungle of our superstitious logic.

The "worship" idea in the Arab culture and in the world at large today, is not letting us focus our attention on the world of ideas and values. They tell us, that ideas are only philosophy. Meaning, in other words that philosophy has nothing to do with practical living. The Islamic reality that is being indoctrinated into the young minds, does not synchronize with the practical realities which they encounter in their mundane careers. The seeds of doubt implanted in our early life are immensely heavy to uproot in later life. Yet, what are we doing about it? As mentioned before, instead of trying to get to the root of the problem, we target the person, who speaks about exploitation and gag him for life. Gentlemen, let me talk about so called Muslims of Pakistan first, having born here, this is the place I am more familiar with. Can anyone please tell me of one college or university, which is fighting tooth and nail, sincerely and practically involved, to bring Islamic rule in this country? I am not talking now about religious preachers. What I mean are those scholars who truly believe Islam as the only natural and scientific system that ought to be established for the well being of all humankind.

Islamic system is a far off story, we cannot even keep our commitments with each other in this country, because of which the army has to intervene, in order to re-establish the law and order in this devastating situation. When the Muslim civilians, become fanatically reluctant to give interest on their money on the one hand, but are lavishly giving bribes on the other hand, then Islam begins to loose its worth in the jungle. It is a strange paradox that one has to sing praises of his black hearted muslim brother, even if he takes away his daily bread and butter. Or salute the slow killer, who makes one work till his bones begin to ache. When civilians begin to misuse the power of guns, then it is time to give a chance to those, who are trained to use guns. Educated and disciplined killers are always far better than serious, ignorant killers. But the best of all systems is one that does not generate killers. These killings can only be abolished, when we organize ourselves with honest hearts, and strengthen our resolves to eradicate exploitation in every form. Even if a fraction of the amount, which the various religious or humanitarian organizations collect from the public, is spent on research of revising our Islamic jurisprudence, that will make the dictates of Quran, as the

first priority of our lives, provide answers to the practical problems of an average citizen. It is only then, our future generations will be able to breathe fresh air.

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(In order to recreate a lively world, we need lively minds; killing and mud slinging will never make lively nations)

Worse than that is the predicament, of the so-called liberal Muslims. They are being taught that life of Mohammed (PBUH) is a role model for all Muslims. If the Messenger's life is an example for men, then we need to know, who must the women follow? Yet the Muslims boast, though very correctly so, it was Islam that raised the status of women equal to men. It is not the physical form of the messenger, a Muslim has to follow, it is the message that he brought of human rights, in our mundane matters. Gentle hearts, the inherent need is for a natural and true Islamic constitution, in order to implement Islamic principles in Pakistan. Shouting slogans, and breaking public laws only leads to jungle life; we will never ever by these methods, be able to build a civilized nation. One honest advocate, ailing with cancer, can and did convince the whole world of his peaceful aims and carved a nation within one generation. Is it not a matter of shame, we have yet to reach a unanimous decision on the definition of a "Muslim" in the legislature? We certainly and indeed can define a "Muslim" if only the leaders of various religious sects remove the gods they have made in their minds. As Iqbal said to the Indian Muslims,

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

On the contrary, when he saw the educated class is beating around the bush, just to grab their immediate selfish motives, he painfully shouted:

کم نظر بے تابیِ جانم ندید
عیشِ کارم دید و پنہانم ندید

(The myopic idiot cannot see my restless passions; he goes only for what roars in front of him and takes that for reality.)

It is beyond my understanding, why our present advocates of law do not demand from the government, who in collaboration with retired and serious scholars, economists, medical doctors and other scientists can draft an Islamic constitution based on the principles of the Quran? Time is of no importance here, it may take this group or committee, five, ten or twenty years. Or may be even more. The emergent need of the day is to have a balanced and peaceful world. In short, a one world government!

If only they could change their vision, and honestly search for peace instead of "Power." Did the messenger in Mecca ask the rich infidels to take off their rich clothes or leave Mecca? Did Jinnah or Iqbal ask Lord Mountbatten to take off his uniform? When nations are growing up, gentlemen, these are trivial matters. We will be great only when no human is small in front of us, other matters are secondary. Jinnah all his mature life was only concerned with one cause, *"To get freedom for the suppressed Muslims; a place where they may be able to implement peaceful laws of Islam according to the Quran."* And peace can only be achieved, when we believe in a peaceful Islam. Was this not the aim of Jinnah, gentle hearts? The next step of Muslims must be, to stand firm on one and only one cause, to seek measures to draft an Islamic constitution based on the scientific, ethical, economic and other principles and values of Quran, if they really want to live in this world with character and dignity. For that we need a down-to-earth leader who can convince and motivate the average citizen towards the peaceful Islam. "Leaders make history," writes Professor Khwaja Masud, "but before they make history, they are made by history." Further quoting the words of Woodrow Wilson (former president of USA) he writes, "When I look back on the process of history, I see this written over every page that nations are renewed from the bottom, not from the top, that the genius which springs from the ranks of the unknown is the genius which renews the youth and energy of the people. The utility, the vitality, the fruitage of life does not come from the top to the bottom; it comes like the natural growth of a great tree, from the soil, up through the trunk into the branches to the foliage and the fruit." (News, February 2, 2004). The present thinking of a common Muslim yet remains; we ought to admit, in the words of Iqbal,

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

(They refuse to change themselves; for this, in their stubborness, they will not even refrain from changing the Quran)

****